قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا تہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اکتوبر 2016ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



رکوع وسجود وعبادت کا مقصد

جب ذہنِ انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہئے کہ اس کا علم (Sense Perception) یعنی حواس کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصولِ علم یا اظہارِ خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے ''خدا'' کے لئے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا اور اسے ہی مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور اور بلوغت میں لا کر مخاطب کیا ہے۔ وہ علم بالحواس کے ساتھ تصوراتی علم پر بھی زور دیتا ہے اور دین کے معاملہ میں بھی شکل کی بجائے معنویت (مقصود ومفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے لیکن وہ شکل کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ عبادات میں رکوع وسجود میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے۔ جسم کی ان حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کارفرما ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں متوازیت (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ اس لئے کہ انسان کو تصورات کی تعبیر کے لئے شکل (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے' نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے ہاتھ' پاؤں' سر' آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ (وہ اس طرح مجرد حقائق (Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے) یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اس قدر بلند ہو جانے کے باوجود' بعض مقامات میں اسے باقی رکھا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا' اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ یہ ''محکومی'' درحقیقت' زندگی کی بلند' مستقل اقدار کو ازخود اپنے اوپر عائد کرنا ہوتا ہے۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے' فطرت کی قوتوں سے ڈر کر' انہیں خوش کرنے کے لئے' اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ اگر انسان کا

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

جلد 69 | شمارہ نمبر 10 | اکتوبر 2016ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِ تعاون	50 روپے فی پرچہ
پاکستان	-/550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/800 روپے سالانہ
بیرون ملک	-/2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/5000 روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	ادارہ	4
پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت (قسط 12)	منظور حسین لیل	6
ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	غلام احمد پرویزؒ	17
مومن کسے کہتے ہیں (بچوں کا صفحہ)	عارف محمود کسانہ	37
تھیوکریسی اور قرآنی ریاست کے درمیانی فاصلے	خواجہ ازہر عباس	39
قرآنی تعلیمات کے مطابق مرد عورت سے افضل نہیں	ڈاکٹر انعام الحق	47

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) Chapter 2: Life's Essence (*Khum-e Zindagi* - خم زندگی) – Message to Fellow-Seekers By G. A. Parwez , Translated by: M. Alam	3 60
Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل) We are also Muslims like other Muslims By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)	63

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

Idara Tolu-e-Islam Bank Account National Bank of Pakistan
Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان) فون: 042-35714546
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

قرآن اور سائنسی نظریات

اکثر یہ پوچھا جاتا ہے کہ اگر قرآن کریم کی تعبیر سائنس کے انکشافات کی رو سے کی جائے تو اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ کل کو اگر سائنس کے موجودہ نظریات غلط ثابت ہو گئے تو اس سے قرآن پر حرف آئے گا۔ اس کی وضاحت کر دیجئے۔

اس کی وضاحت کچھ یوں ہے کہ قرآن کریم کا ایک حصہ اس کے قوانین اور اصولوں پر مشتمل ہے۔ اسے وہ محکمات سے تعبیر کرتا ہے اور یہی ام الکتاب ہیں یعنی وہ انسانوں کو جو راہنمائی دینا چاہتا ہے اس کی اصل اور جڑ یہی ہیں۔ اس حصہ کا مفہوم متعین اور مطالب واضح ہیں' اس لئے اس کی تعبیرات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ مختلف زمانوں میں ان قوانین اور اصولات پر عمل کس طرح کیا جائے گا۔ انسانی علم کی وسعت' ان کی رفعت' ہمہ گیریت اور افادیت کے دلائل بہم پہنچائے گی۔

قرآن کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ اپنے دعاوی کی صداقت پر خارجی کائنات سے شہادات پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے وہ کارگہ کائنات کے نظم ونسق' قوانین خداوندی کی محکمیت۔ تخلیق ارض وسما۔ تنویر شمس وقمر' تکویر لیل ونہار' غرضیکہ انفس وآفاق میں آیات اللہ پر غور وفکر کی تاکید کرتا ہے۔ اسی حصہ میں وہ امور بھی آجاتے ہیں جن کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔ انہیں وہ تشبیہات واستعارات کے انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جس میں مختلف زمانوں میں مختلف تعبیرات سامنے آسکتی ہیں۔ اس لئے کہ ان امور پر انسان اسی حد تک غور وفکر کر سکتا ہے جس حد تک اس کے زمانے میں انسانی علم ترقی کر چکا ہے۔ اگر ایک دور کا انسانی علم' مشاہدہ یا تجربہ کسی سابقہ دور سے مختلف ہوگا تو اس دور کی تعبیرات بھی سابقہ دور سے مختلف ہوں گی۔ مثلاً قرآن کریم نے فرعون (حضرت) موسیٰؑ کی لاش کے متعلق کہا کہ: فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَکَ اٰیَۃً ؕ (10:92) ''پس ہم آج تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے تاکہ تو ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں' ایک نشان ہو''۔ اب ظاہر ہے کہ جس زمانے میں مصریات کے متعلق تحقیق نہیں ہوئی تھی' اس آیت کی تعبیر کچھ اور کی جاتی تھی۔ جب اٹھارویں اور انیسویں صدی میں وہاں کے شاہی مقبروں کی کھدائی ہوئی تو ان سے بیشمار حنوط شدہ لاشیں (ممی) برآمد ہوئیں۔ انہی میں رامیسیس ثانی کی لاش بھی برآمد ہوئی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا فرعون تھا۔ اس انکشاف کے بعد قرآن کریم کی مذکورہ صدر آیت کی تعبیر بھی مختلف ہوگئی۔ اس مثال کا تعلق تاریخی انکشافات سے ہے۔ دوسری مثال فلکیات سے متعلق لیجئے۔ قرآن کریم میں

اجرام سماوی کے متعلق ہے۔ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (36:40)۔تمام (ستارے) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ جب فلکیات کے متعلق قدیم تصور کارفرما تھا تو اس آیت کی تعبیر کچھ اور کی جاتی تھی۔ جب جدید انکشافات کی رو سے فلکیات کے متعلق نئی ''آیات'' (نشانیاں) سامنے آئیں تو اس آیت کی تعبیر کچھ اور ہوگئی۔ تعبیرات کے ان اختلاف سے قرآنی حقائق پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر ہمارے زمانے کی کوئی علمی تحقیق سابقہ دور کی کسی تعبیر کو غلط ثابت کرتی ہے تو اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ اس زمانے کا انسانی علم ناقص تھا۔ اور اگر آج کی کوئی تعبیر بعد میں آنے والے زمانے نے غلط ثابت کر دی تو یہی بات آج کے انسانی علم کے متعلق کہی جائے گی۔ لہٰذا اس باب میں صحیح روش یہ ہے کہ ہم قرآنی حقائق کو علم انسانی کی موجودہ سطح کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں، لیکن اپنی فہم اور اسپر مبنی تعبیر کو حرف آخر قرار نہ دے لیں۔ اس لئے کہ حقائق کی لامتناہیت کا تو یہ عالم ہے کہ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (18:108) ان سے کہہ دے کہ اگر میرے پروردگار کی باتیں لکھنے کے لئے دنیا کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لئے ایسے ہی سمندر اور پیدا کر دیں، جب بھی وہ کفایت نہ کر سکیں۔'' حقائق کی یہی لامحدودیت ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کراتھر نے کہا ہے کہ ''ہمیں کسی موضوع پر حرف آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا چاہئے۔''

یاد رکھئے۔ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے۔ اگر ہم اس کے حقائق کے سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں تو یہ ہمارے تدبر کا قصور یا ہمارے زمانے کی علمی سطح کا نقص ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس خیال سے کہ ہم قرآنی حقائق کے سمجھنے میں کہیں غلطی نہ کر جائیں، ہم ان حقائق پر غور و تدبر کرنا ہی چھوڑ دیں۔ جس خدا نے غور و تدبر کا حکم دیا ہے اسے اچھی طرح سے علم تھا کہ انسانی غور و فکر غلطی بھی کر سکتا ہے اور جس دور میں غور و فکر کرنے والا انسان پیدا ہوا ہے اس دور کی علمی سطح بھی ناقص ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے خارجی کائنات پر غور و فکر کا بھی حکم دیا ہے اور قرآنی حقائق پر بھی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط (41:53) ''ہم انہیں اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھائیں گے۔ تا آنکہ ان پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ (قرآن) واقعی ایک حقیقت ثابتہ ہے۔'' اس باب میں (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) بس اس احتیاط کی ضرورت ہے کہ غور و فکر کرنے والا اپنی تعبیر کو حرف آخر نہ سمجھ لے۔

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قسط نمبر 12

پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت

(قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (47-45-44-5:44)

نظامِ معیشت

منزلِ اوّل:

طلوعِ اسلام اگست 1972ء، ص: 41: ''اس اساسی انقلاب کے بعد، قرآن کے معاشی نظام کی پہلی منزل کی طرف آیئے۔ اس میں وہ ذریعہء پیداوار کو تو انسانوں کی مشترکہ تحویل میں رکھتا ہے لیکن اس کی پیداوار کو ہر ایک کی محنت کے مطابق تقسیم کرتا ہے۔ قرآن نے اپنے نظام کا اساسی اصول یہ بتایا ہے کہ: لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (53:39)۔ یعنی معاوضہ محنت کا ہے۔ اس نظام کے بالکل علی الرغم، اس کی ضد، اس کے مخالف، ایک دوسرا نظام ہے جسے وہ ''ربٰو'' سے تعبیر کرتا ہے۔ یاد رکھئے! ''ربٰو'' کے معنی سود نہیں۔ نہ ہی یہ کسی معاشی نظام کی ایک شق کا نام ہے۔ یہ قرآن کے معاشی نظام کی اصل و اساس کے خلاف دوسرے نظام کا اصول ہے۔۔۔ اور وہ اصول یہ ہے کہ معاوضہ سرمایہ کا ہے۔ اسی کو سرمایہ دارانہ نظام کہتے ہیں۔ چونکہ یہ نظام، قرآنی نظام کی ضد ہے اس لئے قرآن نے کہا ہے کہ اسلامی نظام، اس نظام کے خلاف اعلانِ جنگ ہے (278-2:275)۔ چونکہ قرآنی نظام میں، کوئی شخص، کسی محنت کش کی محنت کے ماحصل میں سے سرمایہ کے معاوضہ کے طور پر کچھ نہیں لے جا سکے گا، اس لئے کام کرنے والوں کو ان کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا۔ جس انقلابِ عظیم کے لئے حضرت موسیٰ کو فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا، اس کی غایت یہ بتائی گئی تھی کہ: لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعَىٰ (20:15) تاکہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے۔ اسی لئے خود قرآنی انقلاب کے متعلق کہا: وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۖ (3:185)، اس میں ہر محنت کش کو اس کے کام کی پوری پوری اجرت ملے گی: وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (3:25)۔ اس میں ہر کاسِب (کام کرنے والے) کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ ملے گا، اور اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی ہوگی۔ کوئی اس کی محنت کو (Exploit) نہیں کر سکے گا۔ اس اصول کو قرآن کریم نے متعدد مقامات پر دہرایا ہے۔ مثلاً (2:281، 3:160، 46:19)۔ سورۂ النجم میں، جہاں اس نے یہ بنیادی اصول بیان کیا ہے کہ معاوضہ محنت کا ہوگا، اس کے

ساتھ ہی اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ: ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (53:41)۔ ہر محنت کش کو اس کی محنت کا بھرپور معاوضہ ملے گا۔ اس میں سے کوئی کچھ بھی غصب نہیں کر سکے گا۔۔ نظامِ سرمایہ داری میں جو لوگ، مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ نہیں دیتے، وہ ان سے واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اس روش سے باز آجاؤ، ورنہ جب تمہارا یہ نظام تباہ ہوگا تو اس کے ساتھ ہی تم بھی تباہ ہو جاؤ گے۔ (ملاحظہ ہو آیات: 7:85، 11:85، 17:35، 26:181، 83:2)۔

ہم سوشلزم کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں کہ محنت کے معاوضہ کی تقسیم کے اصول کی رو سے، حسبِ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں: (1) جو لوگ محنت کرنے سے کسی وجہ سے معذور ہوں، اس نظام میں ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ (2) جن کی ضروریاتِ زندگی، ان کی محنت کے معاوضہ سے پوری نہ ہوتی ہوں، ان کی کمی پوری کرنے کا بھی کوئی انتظام نہیں ہوتا۔۔ اور (3) جن کی محنت کا معاوضہ ان کی ضروریات سے زیادہ ہو، ان کے پاس فاضلہ دولت جمع ہو جاتی ہے جس سے پھر طبقات وجود میں آجاتے ہیں۔۔۔ مارکسزم میں ان اسقام کے ازالہ کی کوئی صورت نہیں۔ لیکن قرآنی نظام میں ان کا ازالہ بطریقِ احسن ہو جاتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جو شخص اس گروہ میں شامل ہو جاتا ہے، جو اس نظام کے قیام کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد، انسانی ذات کی نشوونما ہے اور انسانی ذات کی نشوونما ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دیتے ہیں۔ اس لئے ان لوگوں کو تلقین کی جاتی ہے کہ: (1) تم، اپنی فاضلہ دولت سے، ان لوگوں کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کا انتظام کرو جو، یا تو کسی وجہ سے محنت کرنے سے معذور ہیں، اور یا ان کی ضروریات، ان کی محنت کے معاوضہ سے پوری نہیں ہوتیں (69:34، 10-76:8، 20-89:18)۔ یاد رکھو! تمہاری دولت میں ان لوگوں کا حق ہے۔ اس لئے ان کا حق انہیں ادا کر دو (51:16، 24-70:25)، (2) اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی بتا دیا جاتا ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جس قدر کما لیتے ہیں، وہ ہماری اپنی کاری گری کا نتیجہ ہے، اس لئے کسی کو حق حاصل نہیں کہ اس میں کسی قسم کا دخل دے، وہ قارونی ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اور یہ ذہنیت اس ذہنیت کی ضد ہے، جو قرآن پیدا کرتا ہے (28:78، 39:49)۔ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی صلاحیت و استعداد میں فرق ہوتا ہے۔۔۔ اس سے مقصد صرف تقسیمِ کار ہونا چاہیئے (43:32)۔ جن لوگوں کو بہتر صلاحیتیں حاصل ہوں، انہیں چاہیئے کہ وہ اپنی فاضلہ دولت ان صاحبِ ضرورت افراد کی طرف لوٹا دیں جو ان کے ساتھ کام کرتے ہیں، اور اس کا خیال نہ کریں کہ اس سے ''گھوڑا گدھا'' برابر ہو جائیں گے۔ فاضلہ دولت کو خدا کی عنایت سمجھو اور اسے اس کی ہدایت کے مطابق صرف کرو (16:71، 16:53)، (3) پھر، انہیں یہ تلقین بھی کی جاتی ہے کہ دولت کا ایک جگہ روک رکھنا، دوزخ کی آگ بھڑکانا ہے۔ ایسا بالکل نہ کرو (9:35، 18-72:17، 102:2) روپے کو گردش میں رکھو اور گردش بھی اس انداز سے ہو کہ وہ اوپر کے طبقے ہی میں چکر نہ لگاتا رہے (59:7)۔

انتہائی سٹیج:

آپ نے غور فرمایا کہ مارکسزم کے عبوری دور (یعنی سوشلزم) اور قرآنی نظام کے عبوری دور میں بھی کس قدر بنیادی فرق ہے۔ جب اسی عبوری دور میں افرادِ معاشرہ کے قلب و دماغ میں یہ نفسیاتی تبدیلی پختگی حاصل کر لیتی ہے تو انہیں اس نظام کی اگلی منزل میں لے جایا جاتا ہے، جسے اس پروگرام کی آخری کڑی کہنا چاہیئے۔۔یعنی اس منزل میں جسے مارکسزم نے کمیونزم کہہ کر پکارا تھا اور جس کے متعلق انہوں نے سربگریباں اس کا اعتراف کیا تھا کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دور کیسے آئے گا اس لئے کہ (خود ان کے اعتراف کے مطابق) یہ نظام افرادِ معاشرہ کی دل کی رضامندی سے قائم ہوسکتا ہے، اور مادی تصورِ حیات میں اس کی قطعاً صلاحیت نہیں کہ وہ دلوں میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کر سکے۔ قرآن نے کہا کہ معاشی نظام کی اس اگلی منزل کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ اس میں: (1) تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا، اللہ کی، یعنی خدا کے قوانین کے مطابق قائم کردہ مملکت کی ذمہ داری ہوگی۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)، (2) مملکت، افرادِ معاشرہ کو اس کی ضمانت دے گی کہ: نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (6:151) ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔ دوسری طرف افرادِ معاشرہ سے بھی کہا جائے گا کہ اس جماعت میں شامل ہوتے وقت تم نے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے تم نے اپنی جان اور مال کو خدا کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ اب اس معاہدہ کو، مکمل طور پر پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس کے لئے عملی پروگرام یہ ہوگا کہ ہر شخص پوری پوری محنت سے کام کرے گا اور اسے اس کی ضروریات کے مطابق ملتا جائے گا۔ اس مقام پر کہا گیا کہ:۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) اے رسول ﷺ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اب ہمیں کس قدر دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دینا ہوگا۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہوگا سب کا سب۔ ان سے یہ کہا گیا اور انہوں نے کہا کہ: لبیک۔ اللھم لبیک۔ ہم حاضر ہیں، جان اور مال دونوں لے کر حاضر ہیں۔۔۔ لیجئے صاحب!۔ جس نظام کو مارکس، طبقاتی کشمکش کا آخری اور کامیاب حل قرار تو دیتا تھا لیکن اسے پکارتا تھا۔ خواب و خیال۔ (Utopia)۔ کہہ کر، وہ عملاً متشکل ہوگیا۔ مارکسزم اسے ''خواب وخیال'' کی دنیا اس لئے قرار دیتی تھی کہ اس کے پاس وہ بنیاد نہیں تھی جس پر اس قدر عظیم عمارت استوار ہو سکے۔ وہ صرف تشدد کے ذریعے انقلاب لانے کا طریقہ جانتی تھی، اور اسے تسلیم کرتی تھی کہ تشدد کے ذریعے ایسا نظام کبھی عمل میں نہیں لایا سکتا۔ قرآن کریم نے وہ بنیاد عطا کر دی جس پر یہ عظیم عمارت، افرادِ معاشرہ کی دلی رضامندی سے، بطریق احسن استوار ہو جائے۔ یہ تھی وہ حقیقت جس کی طرف، علامہ اقبالؒ نے روس کی توجہ اُس زمانے میں منعطف کرائی تھی جب وہ خود بھی سوشلزم کے نشہ میں مخمور و بدمست تھا، اور باقی دنیا بھی یہ سمجھ رہی تھی کہ دنیا کا مستقبل اس کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے پہلے قرآن کا وہ معاشی نظام پیش کیا جسے مارکس، اپنے تصور کے نظام کی آخری کڑی (یعنی کمیونزم) قرار دیتا تھا لیکن جس تک پہنچنے کا اُسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس سلسلہ میں (جیسا کہ میں نے

پہلے بھی بتایا ہے)، انہوں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ''زمین'' پر ذاتی ملکیت کا تصور کفر ہے۔

باطنِ الارض للہ ظاہر است ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

انہوں نے زمیندار اور جاگیردار سے للکار کر کہہ دیا کہ:۔

دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

اس کے ساتھ ہی زائد از ضرورت دولت کے متعلق قرآن کا یہ فیصلہ سامنے لے آئے کہ:۔

ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

اور دین کا ماحصل یہ بتایا کہ:۔

کس نگردد، در جہاں، محتاجِ کس نکتۂ شرعِ مبیں، ایں است و بس

قل العفوا:

انہوں نے روسی انقلاب میں اس کائناتی تحریک کے آثار دیکھے جو انسان کو قرآن کے معاشی نظام کی طرف لا رہی تھی۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ:۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم بے سود نہیں، روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا، شوخیٔ افکار، پہ مجبور فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر کھُلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن، اے مردِ مسلمان اللہ کرے تجھ کو عطا، جدتِ کردار
جو حرفِ ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے اب تک اس دور میں شاید، وہ حقیقت ہو، نمودار

لیکن اس کے ساتھ ہی جب انہوں نے مارکسزم کے اس فلسفہ حیات پر غور کیا جس میں، خدا، وحی، رسالت، فرد کی اہمیت، انسانی ذات اور حیاتِ آخرت سے انکار کیا جاتا ہے، تو انہوں نے روس سے للکار کر کہہ دیا کہ تمہاری آرزوئیں لاکھ حسین سہی، اس فلسفہ کی بنیاد پر، کمیونزم کے معاشی نظام کی عمارت کبھی استوار نہیں ہو سکے گی۔ یہ عمارت، قرآن کے پیش کردہ فلسفۂ زندگی ہی پر قائم ہو سکے گی۔ چنانچہ انہوں نے، اپنی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' میں، مارکسزم کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ:

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ

لا و اِلّا:

لیکن (انہوں نے کہا کہ) زندگی کے تعمیری مقاصد کے حصول کے لئے ''لا'' کافی نہیں۔ اس کے ساتھ ''اِلّا'' کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ:۔

در مقامِ ''لا'' نیاساید حیات | سوئے ''اِلا'' می خرامد کائنات
''لا و الا'' ساز و برگِ امتاں | نفیٔ بے اثبات، مرگِ امتاں

اساسِ محکم (ام الکتاب):

اس کے بعد انہوں نے ملتِ روسیہ کو یہ پیغام دیا کہ:۔

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی | دل، ز دستورِ کہن، پرداختی
کردۂ کارِ خداوندان تمام | بگذر از ''لا''، جانبِ ''الا'' خرام
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے | جستۂ او را، اساسِ محکمے؟

یہ اساسِ محکم کہاں سے ملے گی کہتے ہیں:

داستانِ کہنہ شستی باب باب | فکر را روشن کُن از ام الکتاب
(جاوید نامہ)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ اقبالؒ، مارکسزم کے معاشی نظام کی تو حمایت کرتا ہے کیونکہ وہ قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے لیکن اس کے فلسفۂ حیات کا سخت مخالف ہے۔ مسلمان ہونے کی جہت سے اسے اس کا مخالف ہونا ہی چاہیئے تھا کیونکہ یہ فلسفہ، قرآنی تصورِ حیات کی ضد ہے۔ لیکن وہ کمیونسٹوں سے کہتا ہے کہ تم اگر، اندھے تعصب کو چھوڑ کر، دلیل و برہان کی رو سے سوچو گے تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ تمہارا فلسفۂ حیات خود تمہارے نقطۂ نگاہ سے بھی بے حد ناقص ہے کیونکہ یہ اس معاشی نظام کی بنیاد نہیں بن سکتا جسے تم انسانیت کی مشکلات کا حل، اور منتہائے نگاہ قرار دیتے ہو۔ اسی تجزیہ کا نتیجہ تھا کہ مارکس کے متعلق اقبالؒ کا ردِ عمل، ملایانہ غصے اور نفرت کی بجائے، اُس مومنانہ شفقت اور ہمدردی کا ہو گیا جس کے پیشِ نظر، اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کے متعلق کہا تھا کہ: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (18:6)۔ ''اے رسول! ایسا نظر آتا ہے کہ تو اس غم میں اپنی جان گھُلا لے گا کہ یہ لوگ صحیح نظریۂ حیات کو تسلیم کیوں نہیں کرتے۔'' حسرت و ہمدردی کے یہی ملے جلے جذبات تھے جن کی بناء پر علامہ اقبالؒ کبھی مارکس کے متعلق کہتے تھے کہ:۔

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل | یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

اور کبھی یہ کہ:۔

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است | قلبِ او مومن، دماغش کافر است

ارمغانِ حجاز میں، وہ ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے، مارکس کے متعلق کہلواتے ہیں:

وہ کلیمِ بے تجلی، وہ مسیحِ بے صلیب | نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

میں سمجھتا ہوں کہ اقبالؒ نے جو کچھ مارکس کی تعریف میں کہا ہے، کسی بڑے سے بڑے مارکسسٹ نے بھی شاید وہ کچھ نہ کہا ہو۔ اور انہوں نے اُس کے خلاف جو کچھ کہہ دیا ہے وہ، کسی کٹر سے کٹر ''اسلام پسند'' کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ مارکسزم کے معاشی نظام کی یہی وہ افادیت، اور اس کے فلسفہء حیات کا بنیادی سقم تھا، جس کی بناء پر، حضرت علامہؒ نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام اپنے خط میں، وہ فقرہ لکھا تھا جو اب بطور ضرب المثل زبان زد خلائق ہے۔'' اس کے بعد پرویز صاحب نے خط کا پورا اقتباس درج کیا ہے۔ جس میں وہ مخصوص فقرہ یہ ہے۔

''بالشوازم جمع خدا بڑی حد تک اسلام کے مماثل ہے۔''

قارونی ذہنیت:

(ضمناً:۔ اگر کوئی یہ کہے کہ وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت اُنہیں کیسے دے دے جو محنت کرنے کے قابل نہیں۔ تو یہ قرآنی حقیقت اُس کے سامنے رہنی چاہیئے کہ اسے قرآن نے قارونی ذہنیت قرار دیا ہے۔ قارون یہ کہا کرتا تھا کہ اس نے اپنی محنت سے دولت کمائی ہے، وہ یہ دولت محروموں میں کیوں تقسیم کر دے ! لیکن چونکہ اسلامی مملکت کی حیثیت ''ماں'' کی ہوتی ہے، اور کوئی ماں نہیں چاہتی کہ اس کے کمانے والے بچے، اس کے ان بچوں کو (جو کہ ان کے بھی بھائی بہن ہیں اور) جو کسی وجہ سے کمانے کے قابل نہیں، اپنی خون پسینے کی کمائی میں سے نہ دیں۔ ماں بہر حال، اپنے سب بچوں کو اُن کی ضرورت کے مطابق تقسیم کر کے دیتی ہے۔

مملکت، ماں:

ماں کی ممتا کی وجہ یہ ہے کہ بچہ اس کے ''رحم'' میں پرورش پاتا ہے۔ خدا نے بھی خود کو ''رحیم اور رحمٰن'' قرار دیا ہے۔ ''رحمان اور رحیم'' کی صفات میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کا ''ماں کی محبت'' جیسا تصور موجود ہے (دیکھئے پرویز صاحب کی مرتبہ لغات القرآن جلد دوم عنوان۔ ر۔ ح۔ م۔ ایک ہی ہے)۔ اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت کا کام عملاً قرآنی مملکت سے لیتا ہے۔ یہ مملکت، ایک ماں کی طرح، اپنی کمانے والی اولاد کی دولت اپنی تحویل میں رکھ کر اپنے تمام (صحت مند، کمزور اور معذور) بچوں میں ان کی ضروریات کے مطابق تقسیم کرے گی۔ اور جو کمانے والا یہ کہے گا کہ وہ محنت سے کمائی ہوئی اپنی حلال دولت دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کیوں اور کیسے دے دے تو اسے ''قارون'' قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا، کوئی مومن اسلامی حکومت میں نہ ایسا سوچے گا نہ ایسا کرے گا۔ وہ اپنے دل کی پوری رضامندی سے اپنے محروم بھائیوں کی ضروریات کے لئے (نظریۂ قل العفوا کے تحت) اپنی حلال کمائی دے دے گا۔ قرآن کریم نے مومنین کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے۔ ''اخوۃ'' کا تصور یہی ہے۔

نجی ملکیت تا بحدِ ضرورت:

اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اسلامی مملکت اپنے مسلم باشندوں سے ''قل العفوا'' کے حکم کے تحت ضرورت سے زیادہ لے کر امت کو معاشی طور پر تنگ، پریشان اور ہراساں کر کے مایوسیوں اور محرومیوں میں دھکیل دینا چاہتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ضرورت کی حد تک ہر شخص اپنے پاس رکھ سکتا ہے (یعنی اپنی ضرورت کی حد تک نجی ملکیت کی اجازت ہے لیکن ضروت سے زیادہ رکھنا جائز نہیں۔ ''ضرورت'' کی کوئی خاص متفقہ علیہ تعریف نہیں ہے، ایک قرآنی حکومت ساری امت کے مجموعی حالات کو سامنے رکھ کر وقتاً فوقتاً ''ضرورت'' کی تعریف متعین کرتی رہے گی) اور باقی، جذبہء اخوت کے تحت، دوسروں کی ضرورت کے لئے، اپنے دل کی پوری رضامندی سے دے دیتا ہے۔ دوسرے، امت اس طرح قربانی دے کر ایک اعلیٰ مقصد (فلاحِ امت وفلاحِ انسانیت) کی طرف پیش قدمی کرتی ہے اور بالآخر آہستہ آہستہ پوری امت کی مجموعی معاشی حالت مایوسیوں اور محرومیوں سے نکل کر اوپر کو اٹھتی ہے اور پوری امت اجتماعی طور پر معاشی اور سیاسی طاقت اور سربلندی حاصل کر لیتی ہے اور یہی قرآن کا حقیقی مدعا اور منشاء ہے (مؤلف)

ارتکازِ دولت:

طلوعِ اسلام ستمبر 1982ء، صفحہ نمبر:5، ''قرآن کا یہ معاشی نظام صدرِ اوّل تک جاری رہا۔ اس کے بعد ملوکیت آ گئی اور اس نے نظامِ سرمایہ داری کو پھر سے قائم کر دیا۔ ایسا کرنے میں ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ قرآن کے وہ احکام تھے جن میں دولت جمع کرنے کو سنگین جرم اور عذابِ جہنم کا مستوجب قرار دیا گیا ہے۔ اس قسم کی رکاوٹیں، وضعی روایات کی رو سے دور کر لی جاتی تھیں۔۔۔ (مثلاً) سورہء توبہ میں ہے:۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (35-9:34)۔ ''جو لوگ چاندی اور سونا (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے، اے رسول! تم اعلان کر دو کہ وہ ایک الم انگیز عذاب میں ماخوذ ہوں گے۔ اس دن ان کے چاندی اور سونے کے ان سکّوں کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور پھر ان سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے مختص کر رکھا تھا۔ آج تم اپنے خزانہ سے پیدا ہونے والے عذاب کا مزہ چکھو''۔ دولت جمع کرنے کے خلاف اگر قرآن میں دیگر متعدد آیات نہ بھی ہوتیں، تو بھی یہ ایک آیت نظامِ سرمایہ داری کو ختم کر دینے کے لئے کافی تھی۔ لیکن اس آیت کی تفسیر میں یہ روایت وضع کر لی گئی:۔ ''حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس عمرؓ

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبی اللہ ﷺ! یہ آیت آپ ﷺ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کا یہ بیان سن کر حضرت عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔'' (مشکوٰۃ۔۔کتاب الزکوٰۃ)۔

احیائے نظامِ سرمایہ داری:

یہ روایت زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ یہ وضعی ہے لیکن جس مقصد کے لئے یہ وضع کی گئی تھی اس نے وہ مقصد پورا کر دیا۔ یعنی اس سے نظامِ سرمایہ داری کے احیاء کے لئے سند ہاتھ آ گئی۔ اس سے وہ تمام آیات جن میں دولت جمع کرنے کے خلاف سخت وعید آئی ہے، منسوخ قرار پا گئیں۔ کیونکہ جب جمع شدہ دولت میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ نکال کر بقایا دولت کو پاک کر لیا جائے تو مال جمع کرنے کی ممانعت ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف اڑھائی فیصد روپیہ کو بطور خیرات بانٹنے کے لئے محتاجوں اور ناداروں کا وجود لاینفک ہو گیا۔۔ قرآن کی وہ آیات جو عبوری دور میں انفرادی امداد کے لئے نازل ہوئی تھیں، انہیں مستقل احکام قرار دے کر، زکوٰۃ نکالنے کی تلقین کے لئے بطور سند پیش کیا جانے لگا۔ زکوٰۃ (جو خیرات ہی کا دوسرا نام تھا) کے فقہی مسائل مرتب ہونے لگے۔ دورِ ملوکیت میں وضع کردہ یہی نظامِ سرمایہ داری، اسلام کا معاشی نظام قرار پایا۔ اسی نظام کو اب یہاں اسلامی نظام کے نام سے قائم کیا جا رہا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر اسلام کا منشاء یہ ہوتا کہ غریبوں اور ناداروں کا وجود نہ رہے تو قرآن میں ان کا ذکر کیوں آتا اور انہیں صدقہ، خیرات دینے کے احکام کیوں دیئے جاتے!۔۔۔ آپ نے غور فرمایا کہ ایک وضعی روایت نے کس طرح سارے قرآن کو اُلٹا کر رکھ دیا!۔ اس کی رو سے امیروں اور غریبوں کی طبقاتی تفریق اور نظامِ سرمایہ داری کو مستقلاً خدائی سند حاصل ہو گئی۔۔۔ یعنی دولت کی غلط تقسیم سے ایک طرف چند افراد کے ہاں دولت کے انبار در انبار جمع ہونے دو، اور دوسری طرف مفلسوں اور ناداروں کے ہجوم پیدا کرتے رہو۔۔ اور پھر دولتمندوں سے کہو کہ وہ صدقہ اور خیرات سے ان کی مدد کریں۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہودی ایسا ہی کچھ کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے۔ اور جب دوسرے لوگ ان خانماں خراب لوگوں کو گرفتار کر لیتے تو صدقہ خیرات سے ان کا فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے۔ اور سمجھتے کہ انہوں نے بڑا نیک کام کیا ہے۔۔ قرآن نے ان کی اس غلط روش کی سخت مذمت کی ہے (2:85)۔ یہی حالت ہماری ہے۔ دولت کی غلط تقسیم سے ہم پہلے، لوگوں کو مفلس اور نادار بنا دیتے ہیں اور پھر صدقہ اور خیرات سے ان کی مدد کر کے جنت میں گھر خرید لیتے ہیں!۔''

مولانا مودودیؒ:

''قرآن سونے اور چاندی کے جمع کرنے پر سخت وعید فرماتا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت 34 کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے۔ اس کے عموم میں اتنی گنجائش بھی نظر نہیں آتی کہ آپ روزمرہ کے خرچ سے زائد ایک پیسہ بھی اپنے پاس رکھ سکیں۔ یا آپ کے گھر کی

خواتین کے پاس سونے یا چاندی کا ایک تار بھی زیور کے طور پر رہ سکے۔ یہ نبی ﷺ ہی ہیں جنہوں نے بتایا کہ سونے اور چاندی کا نصاب کیا ہے اور بقدرِ نصاب یا اس سے زیادہ سونا چاندی رکھنے والا اگر اس پر ڈھائی فی صدی کے حساب سے زکوٰۃ ادا کر دے تو وہ قرآن مجید کی اس وعید کا مستحق نہیں رہتا۔'' (سنت کی آئینی حیثیت۔ص:90، ایڈیشن اکتوبر 1963ء)۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ اس قسم کی روایات قرآن کریم کی نبوی ﷺ وضاحت وتشریح نہیں بلکہ قرآن کریم کے احکامات برخلاف ارتکازِ دولت میں تبدیلی ہے۔ لہٰذا ایسی روایات جو نظامِ سرمایہ داری کے احیاء کے لئے گھڑی گئیں، کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قرآنی احکامات میں تبدیلی کا کسی کو اختیار حاصل نہیں، حتیٰ کہ خود حضور کریم ﷺ کو بھی۔ ملاحظہ ہوں: سورۂ یونس:15، سورۂ کہف:27-26، ساتھ ہی یہ ناقابلِ انکار حقیقت بھی کہ حضور کریم کی اپنی زندگی، جو ہمارے لئے نمونہ ہے، قرآن کریم کے مطابق تھی۔ اُن کے پاس کبھی بھی دولت کے انبار جمع نہیں رہے تھے (مؤلف)۔

دولت کی تقسیم:

طلوعِ اسلام فروری 1972ء، ص:39، ''اس وقت دنیا میں اشتراکی نظام (کمیونزم) کا بڑا شہرہ ہے۔ اس نظام کا سنگِ بنیاد یہ اصول بتایا جاتا ہے کہ: From each according to his capacity ; To each according to his needs.۔ یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے، اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔ اشتراکیت کا یہ اصول، اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے، ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں، سوشلزم کا نظام رائج ہے۔۔ اس لئے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا (روس اور چین اب پلٹ کر نظامِ سرمایہ داری کی طرف آ رہے ہیں)۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مالِ غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہ ﷺ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادی شدہ کو دگنا حصہ۔ کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔۔ یہ اس لئے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو رزق۔۔۔ یعنی سامانِ زیست۔۔۔ مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا۔ اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں کیفیت یہ ہو کہ: اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (20:119-118) نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو۔ اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریاتِ زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔۔۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے اور دیگر سامانِ آسائش وزیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس کا نقشہ

جنتی بنتا جاتا ہے۔جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ (22:23) نہایت اعلیٰ درجہ کے ملبوسات، ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ (18:31)۔دبیز ولطیف ریشم کے زرکار پردے۔سرر موضونۃ۔مرصع اور نرم ونازک صوفے۔ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا (76:15)۔چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔غرضیکہ۔ نَعِيمًا وَّمُلْكًا كَبِيرًا (76:20)۔عظیم مملکت اور اس میں سامانِ آسائش نہایت فراواں۔۔اور پھر یہ سامانِ آسائش وآرائش کسی خاص طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہوگا۔بلکہ ہر فردِ معاشرہ کے لئے یکساں۔قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جایئے۔اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں ایک خاص طبقہ کے لئے ہوں گی۔اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو میسر ہوگا۔اس میں سب کا معیارِ زندگی اتنا بلند ہوگا۔جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہوسکتا۔۔۔

برائی کے سرچشمے:

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجئے۔ان کے اوّلین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔یعنی افراطِ زر، یا افلاس و نکبت۔افراطِ زر سے سرکشی وطغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔اور نکبت وافلاس سے پستی ودنایت کے انسانیت کُش عیوب وذمائم۔جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراطِ زر ہوگا، نہ افلاس وزبوں حالی، تو ظاہر ہے کہ اس میں، ان سے پیدا ہونے والے عیوب و ذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا۔حسد، کینہ، انتقام، تنگ نظری، حرص، ہوس، فریب کاریاں، مکاریاں، سازشیں۔۔۔اور دوسری طرف بے حمیتی، بے غیرتی، ذلتِ نفس، تملق، خوشامد، منافقت وغیرہ۔یہ سب عیوب (معاشی و) معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔۔جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان، وجہء ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔۔۔اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيمًا نہ اس میں لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے، نہ کوئی ایسی حرکت، جس سے کسی کے دل میں افسردگی اور اضمحلال پیدا ہو۔اِلَّا قِيلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (56:25-26)۔اس میں ہر طرف سے سلامتی کو نشیدِ دلنواز وآہنگِ روح افروز سنائی دیتی ہے۔۔وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (7:43)۔۔ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک وصاف ہوں گے جنہیں انسان، غلط معاشرہ میں، دل میں چھپائے رکھتا ہے۔اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔۔۔تکریمِ انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا، نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔۔(اس سے آگے جاوید نامہ کے انقلابی اشعار درج ہیں، جن میں اقبال نے جنتی معاشرہ کا نقشہ کھینچا ہے۔آخری شعر میں ہے کہ قرآنی مملکت وہ ہے کہ):۔

کس دریں جا سائل ومحروم نیست　　عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (21:92)۔ اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلادہ زیبِ گلو اور نیچے ساری امت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:78)۔ اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا، خواہ اسے ضابطہء قوانین اور حکومت حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے محتاج بنا دیا جائے۔۔۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔'' تھوڑا سا آگے چل کر لکھتے ہیں:۔ ''حقیقت یہ ہے کہ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بد دیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بد دیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بد دیانتی اور رشوت خوری کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا ہے۔ یہ عدمِ تحفظ (Insecurity) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اس کی ابتداء تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد، زر اندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لئے چلی جاتی ہے۔۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس میں تمام افرادِ مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔ اور نہ ہی اس میں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔۔۔ لہٰذا، اس نظام میں کوئی شخص بد دیانت ہو نہیں سکتا۔ اسے بد دیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔''

(جاری ہے)

خریدار حضرات توجہ فرمائیں

مجلّہ طلوعِ اسلام کی درج ذیل خوبصورت جلدیں 600 روپے فی جلد علاوہ ڈاک خرچ دستیاب ہیں۔

1970ء	1972ء	1975ء	1976ء	1977ء
1983ء	1984ء	1985ء	1986ء	1987ء
1988ء	1991ء	2009ء	2010ء	2011ء
2013ء	2014ء	2015ء	2012ء	

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟

آپ کسی سے بات کیجیے اور زندگی کے کسی شعبے سے متعلق کیجئے، حاصل گفتگو یہ ہوگا کہ ہمارے ہاں لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ گھر کے افراد میں کیریکٹر نہیں۔ پڑوسیوں میں کیریکٹر نہیں۔ اہل محلّہ میں کیریکٹر نہیں۔ کاروباری دنیا میں کیریکٹر نہیں۔ دفاتر میں، عدالتوں میں، ایوان حکومت میں، ارباب نظم ونسق میں، غرضیکہ کہیں بھی کیریکٹر نہیں ملتا۔ آپ کسی خرابی کا تجزیہ کریں۔ کسی شکایت کے بنیادی سبب کا سراغ لگائیں، آخرالامر آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ سب کیریکٹر کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ قوم کے زوال کا باعث ہے تو یہی مرض اور پاکستان کی تباہی کا موجب ہے تو یہی علت۔ یہ روگ، قوم اور ملک کو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھائے جارہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے قصر حیات کا ہر ستون کھوکھلا ہو چکا ہے اور ہر قلب حساس اس خطرے سے متوحش ہے کہ کہیں ذرا سا بھی دھچکا لگا تو یہ عمارت چھت سمیت نیچے آگرے گی۔

کیریکٹر کے متعلق ہم گفتگو تو اسی شرح وبسط اور تکرار واصرار سے کرتے ہیں، لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں تو شاید سو میں سے ایک آدھ بمشکل بتا سکے کہ اس کا متعین مفہوم کیا ہے۔ جو کچھ عام طور پر کہا جائے گا وہ یہی ہوگا کہ جب تک کسی کو رشوت نہ دی جائے کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ لوگوں کو یہ بھی کہتے سنیں گے کہ صاحب! اس موجودہ افسر سے تو وہی افسر اچھا تھا جو دس روپے لے کر کام کر دیتا تھا۔ اس کے ہاتھوں تو دنیا تنگ آچکی ہے۔ جس کی فائل اس کے سامنے ہو اس کے متعلق یہ پہلے پتہ کرتا ہے کہ اس نے سابقہ الیکشن میں ووٹ کسے دیا تھا۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جس مقام پر کسی کے کام میں کوئی رکاوٹ پڑے یا اسے کوئی نقصان ہو تو وہ کہہ دے گا کہ لوگوں میں کیریکٹر نہیں رہا۔ لیکن ظاہر ہے کہ کیریکٹر کی یہ تعریف (Definition) تو بے معنی ہے؟ لہٰذا سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟

کیریکٹر کی تعریف:

علمی نقطۂ نگاہ سے اس سوال کا تعلق اخلاقیات (Ethics) سے ہے۔ لیکن علمائے اخلاقیات بھی جس انداز سے کیریکٹر کی تعریف (Definition) بیان کرتے ہیں اس سے عام لوگوں کے لیے بات صاف نہیں ہوتی۔ مثلاً (Soren Kierkligarrd) کے نزدیک:

اخلاق، کیریکٹر کا نام ہے اور کیریکٹر وہ ہے جو انسان کی ذات کے اندر منقوش ہے۔ کیریکٹر درحقیقت داخلیت کا نام ہے۔ بداخلاقی بھی توانائی کی حیثیت سے کیریکٹر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نہ تو اچھے اخلاق کا مالک ہے اور نہ ہی برے کا تو وہ

انسان نہیں حیوان ہے۔

(The present Age)

پروفیسر وہائٹ ہیڈ کے نزدیک کریکٹر، صداقت (Truth) کے مظاہرہ کا نام ہے اور جب ظاہر (Appearance) حقیقت (Reality) کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو اسے صداقت کہتے ہیں۔

(Adventure of Ideas)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ کیریکٹر درحقیقت خیر (Good) اختیار کرنے کا نام ہے۔ خیر کے معنی ہیں ایسا سفر جس میں ہر قدم منزل مقصود کی طرف اٹھے اور شر کے معنی ہیں انسانی ممکنات کا بگولے کا سا رقص۔ (Between Man and Man)

باردیو کے نزدیک ''اپنے آپ پر قابو رکھنے کا نام کیریکٹر ہے۔'' اس کی تائید (Alexandar Loveday) بھی کرتا ہے۔ (Teinter) کا قول ہے کہ:

انسانی ماحول کے متعلق انسان کا وہ رویہ جو مستقل ہو اور اس کا مظاہرہ اس کے اعمال سے ہوتا رہے، کیریکٹر کہلاتا ہے۔

(The Concept and Education of Character)

آپ نے دیکھا کہ کیریکٹر کی ان (Definitions) سے بات صاف نہیں ہوتی۔ آیئے ذرا عام فہم الفاظ میں دیکھیں کہ کیریکٹر کا مفہوم کیا ہے؟

مال صدقۂ جان

ہمارے ہاں ایک عام محاورہ ہے۔۔۔ مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو۔۔۔ اس محاورہ کا پہلا حصہ بالکل واضح ہے۔ یعنی مال بھی اپنی قیمت رکھتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے انسان کو حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا چاہیے۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز باقی رہ سکتی ہو تو اس وقت جان کی حفاظت کے لیے مال کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے۔۔۔ یعنی جان کی حفاظت کے لیے مال قربان کر دیتا ہے۔۔۔ تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بڑا بلند ہے۔ نہ ہی اس شخص کے متعلق جو جان دے دیتا ہے لیکن پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست تھا۔ آپ نے اس بینے کا قصہ سنا ہوگا جو سخت بیمار ہو گیا اور اس کا بیٹا سول سرجن کو بلا لایا۔۔۔ اس لیے نہیں کہ اس کے علاج سے اس کے باپ کو شفاء ہو جائے گی بلکہ اس لیے کہ برادری والے یہ نہ کہیں کہ اس نے باپ کا اچھی طرح علاج نہیں کرایا۔۔۔ سول سرجن نے مریض کو دیکھا۔ مرض کی تشخیص کی۔ پھر نسخہ لکھا جس میں مختلف قسم کی قیمتی دوائیں تجویز کیں۔ ڈاکٹر رخصت ہوا تو بیٹا نسخہ لے کر بازار کو چلا۔ باپ نے آواز دی اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بازار سے دوائیاں خریدنے جا رہا ہوں تا کہ علاج شروع کیا جائے۔ باپ نے کہا کہ یونہی بلا پوچھے گچھے نہ خرید لینا۔ پہلے

پنڈت جی کے پاس جانا اور معلوم کرنا کہ کریا کرم (تجہیز و تکفین) پر کیا خرچ ہوگا اور پھر دوائیوں کی قیمت دریافت کرنا۔ دونوں میں جو سستا ہو اسے اختیار کرنا۔

آپ کو بنئے کی اس بات پر بے اختیار ہنسی آجائے گی لیکن آپ اس کے متعلق یہ نہیں کہیں گے کہ اس کا کیریکٹر پست تھا۔ آپ یہی کہیں گے کہ وہ بڑا بیوقوف تھا۔ جان کی حفاظت (Preservation of Self) ایک جذبہ ہے جو ہر ذی حیات میں جبلی طور پر (By Instinct) پایا جاتا ہے۔ چیونٹی کو دیکھیے۔ ننھی سی جان ہے لیکن اگر کوئی اس کے راستہ میں ذرا سی رکاوٹ بھی ڈالے جس سے اسے خطرہ محسوس ہو تو وہ اپنی حفاظت کے لیے کس قدر ہاتھ پاؤں مارتی ہے؟ یہ جذبہ تمام حیوانات میں پایا جاتا ہے۔ یہ حیوانی سطح زندگی کے ایک جبلی جذبہ کا مظاہرہ ہے جو انسان اس کے خلاف کرتا ہے اسے عقل و ہوش سے عاری سمجھا جاتا ہے۔۔۔ جو شخص اپنے آپ کو نقصان پہنچائے اسے پاگل کہتے ہیں۔

جان صدقہ آبرو

اب اس محاورے کے دوسرے حصے کو لیجیے۔ یعنی ''جان صدقہ آبرو'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جان بھی اپنی قیمت رکھتی ہے اور اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ لیکن اگر ایسا وقت آجائے کہ جان اور آبرو میں (Tie) پڑ جائے۔ جب ان دونوں میں صرف ایک کو بچایا جا سکے تو پھر انسان کو چاہیے کہ جان دے دے لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے دے۔ جو شخص آبرو کو بچانے کے لیے جان دے دیتا ہے۔ ساری دنیا اس کے متعلق کہتی ہے کہ اس نے بلند کیریکٹر کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص آبرو کو ہاتھ سے جانے دے اور اپنی جان بچالے اسے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ہر شخص کہتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت پست ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ جان بچانے کا جذبہ ہر انسان میں جبلی طور پر پایا جاتا ہے۔ اس لیے جو شخص (مثلاً مال کی قربانی سے) جان بچالیتا ہے اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ اس کے برعکس آبرو کا تعلق حیوانی دنیا سے نہیں۔ حیوانات، آبرو کے تصور سے آشنا تک نہیں ہوتے۔

کیریکٹر کی تعریف

یہ صرف انسانی خصوصیت ہے۔ اس کا تعلق شرف انسانیت سے ہے۔ اس لیے جو شخص جان دے کر شرف انسانیت کو بچالیتا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔ آبرو انسانی قدر (Human Value) ہے۔ اس قسم کی اور اقدار بھی ہیں، جن کا تعلق انسانیت سے ہے۔ ان اقدار کا تحفظ زندگی کو حیوانی سطح سے بلند کر کے انسانی سطح پر لے جاتا ہے۔

لہٰذا بات یوں ہوئی کہ جو شخص کسی انسانی قدر کی حفاظت کے لیے اپنے طبعی تقاضے کو قربان کر دیتا ہے اسے کیریکٹر والا انسان کہتے ہیں۔ آئندہ سطور میں اسی اجمال کی تفصیل آپ کے سامنے آئے گی۔

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ آبرو کے تحفظ کے لیے جان دے دینے والا، صاحب کردار کہلاتا ہے۔ آبرو ایک جامع لفظ ہے

جس کا اطلاق انسانیت کے مختلف گوشوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً جب یہ کہا جاتا ہے کہ خدا نے میری آبرو رکھ لی تو اس سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے اپنے ہم عصروں میں شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔ لیکن آبرو کا ایک مفہوم ایسا ہے جو بہت نمایاں ہے۔ اس کا تعلق عفت وعصمت سے ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے اپنی آبرو بچانے کے لیے جان تک دے دی تو اس سے عفت وعصمت ہی مقصود ہوتی ہے۔ آبرو کے اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر ان مثالوں پر غور کیجئے جو ابھی بیان کی جاتی ہیں۔

آبرو کا معیار

ہمارے ہاں اگر کوئی بدباطن، کسی شریف زادی کے برقعے کی طرف بھی بری نگاہ سے دیکھے تو اس لڑکی کا باپ یا بھائی اس شخص کو گولی مار دے گا۔ خود اس کے لیے اسے پھانسی کے تختے پر بھی کیوں نہ چڑھنا پڑے۔۔۔ لیکن یورپ میں کوئی لڑکی اپنے آپ کو کسی نوجوان کی آغوش میں بھی کیوں نہ دے دے اس کے باپ یا بھائی کی پیشانی پر شکن تک نہیں پڑے گی۔ بلکہ وہ خوش ہوں گے کہ ان کی لڑکی (یا بہن) سوسائٹی میں بڑی ہردلعزیز (Popular) ہو رہی ہے۔ اس نے اپنا (Boy Friend) تلاش کر لیا ہے۔ اس سے ایک اہم سوال ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ جو شخص کسی انسانی قدر (Human Value) کی حفاظت کرتا ہے اسے کیریکٹر کا مالک قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جو مثال ابھی ابھی ہمارے سامنے آئی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ''انسانی اقدار'' ہر معاشرہ (Society) کی اپنی اپنی ہیں۔

مختلف اقدار ہیں

ایک قدر جو ہمارے معاشرہ میں اس قدر اہمیت رکھتی ہے، دوسرے معاشرہ میں اسے قدر سمجھا ہی نہیں جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف معاشروں میں کیریکٹر کا معیار مختلف ہوگا اور ہم کسی چیز کو انسانی کیریکٹر یا عالمگیر کیریکٹر قرار نہیں دے سکیں گے۔ ہم ماں باپ کی اس قدر عزت اور تعظیم کرتے ہیں۔ لیکن ایسے قبائل بھی گزرے ہیں جو ماں باپ کو کھا جانا ایک مقدس فریضہ سمجھتے تھے۔ مقدس (Puritans) حبشی بچوں کو چرا کر لے جانے اور آئرستان کے باشندوں کو گولی مار دینے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں ایک دوسرے سے سود لینا معیوب بلکہ جرم تھا لیکن غیر یہود سے سود لینے کی عام اجازت تھی۔ بحرالکاہل کے قریب ایک قبیلہ ہے جس کے نزدیک بددیانتی پسندیدہ ترین اخلاق سمجھی جاتی ہے جو شخص جس قدر کامیابی سے دھوکا دے سکتا ہو اسے اسی قدر عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ٹھگوں کے ہاں وہ نوجوان سب سے زیادہ قابل فخر سمجھا جاتا ہے جو مظلوم راہرو کو پرفریب طریق پر قتل کر ڈالے۔

نیشنلزم آج ساری دنیا کا مسلمہ انداز سیاست واجتماعیت ہے۔ اس مسلک کی رو سے جو شخص دوسری قوموں کو لوٹ کھسوٹ کر اپنی قوم کی مرفہ الحالی کا سامان بہم پہنچائے اسے سب سے بڑا محب وطن سمجھا جاتا ہے۔ اس کے مجسّمے نصب ہوتے ہیں اور اس کا شمار بلند ترین انسانوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا عقیدہ (Rumelin) کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

مملکت کا بنیادی فریضہ اپنے مفاد کے تحفظ اور اپنی قوت کی نشوونما ہے۔ اسے کسی دوسری مملکت کے مفاد کا خیال صرف

اسی صورت میں رکھنا چاہئے جب اس سے اس کے اپنے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام ہر اخلاقی تقاضے پر مقدم ہے اور اس کے لیے ہر قربانی جائز۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ:

1۔ کیریکٹر نام ہے انسانی اقدار کے تحفظ کا۔۔۔ لیکن

2۔ یہ اقدار ہر معاشرہ میں مختلف ہیں، حتیٰ کہ نیشنلزم کے مسلک کی رو سے اپنی قوم کے مفاد کا تحفظ بلند ترین قدر ہے۔ خواہ اس کے لیے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے۔

لہٰذا اس تصور کی رو سے دنیا میں نہ کوئی عالمگیر مستقل اقدار ہیں اور نہ ہی کیریکٹر کا کوئی عالمگیر مستقل معیار۔ کیریکٹر کے معنی ہوں گے ان اقدار سے ہم آہنگ رہنا جنہیں کوئی معاشرہ کسی وقت اپنے ہاں مستحسن قرار دے لے۔ سپارٹا میں چوری کرنا مستحسن خیال کیا جاتا تھا۔ اس لیے وہاں سب سے بڑا چور سب سے بلند کیریکٹر کا انسان تصور ہوتا تھا۔ آج چوری کرنا جرم ہے اس لیے چور بدترین کیریکٹر کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی کنواری لڑکی کا حاملہ ہو جانا سارے خاندان کی رسوائی کا موجب قرار پاجاتا ہے لیکن یورپ میں کسی بالغ جوڑے کا باہمی رضامندی سے اختلاط نہ عیب سمجھا جاتا ہے نہ جرم۔ حتیٰ کہ اب وہاں تراضی مابین سے لواطت کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس کی وہاں قانوناً اجازت ہے۔

قرآنی نقطۂ نگاہ

یہ ایک نقطہ نگاہ ہے۔ یعنی جب کسی بات کو کوئی معاشرہ معیوب قرار دے تو اس کا ارتکاب قابل نفرت اور مستوجب سزا ہوتا ہے۔ جسے وہ ایسا تصور نہ کرے، اس کا ارتکاب نہ بے عزتی کا باعث سمجھا جاتا ہے نہ موجب عقوبت۔ لیکن قرآن کا نقطۂ نگاہ دوسرا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے انسانوں کا طرز معاشرت اور انداز بود و باش مختلف ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کی اقدار مختلف نہیں ہو سکتیں۔ انسانی اقدار ہر جگہ ایک ہی ہونی چاہئیں اور ایسی ہونی چاہئیں جن میں کوئی ردوبدل نہ کر سکے۔ یہ اقدار عقل انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ وحی کے ذریعے ملتی ہیں۔ آج یہ اقدار قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں جو تمام نوع انسان کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضابطہ ہدایت ہے۔ انہیں مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے۔ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام کیریکٹر ہے۔ قرآن اسے ''تقویٰ'' کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ مغرب کے مشہور عالم اخلاقیات راشڈل (Hastings Rashdal) کے الفاظ ہیں:

اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لیے ایک مطلق معیار ہے۔ جو ہر انسان کے لیے یکساں ہے[1]

جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے یہ اقدار عقل انسانی کی وضع کردہ نہیں ہو سکتیں۔ یہ وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ اس باب میں راشڈل کہتا ہے:

[1] The Theory of Good and Evil, Vol. II, P311

اس قسم کا اخلاقی قانون کسی انسانی شعور سے نہیں مل سکتا۔ انسان اخلاقی مسائل کے متعلق الگ الگ نگاہ رکھتا ہے اور اس امر کی ہمارے پاس کوئی خارجی دلیل نہیں کہ دنیا کے تمام انسان اخلاقیات میں کبھی ایک ہی نگاہ رکھیں گے۔[1]

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ان اقدار کا تعلق انسان کی انسانی سطح زندگی (Human Level of Life) سے ہے۔ حیوانی سطح سے نہیں۔ حیوانی سطح زندگی کو طبعی زندگی (Physical Life) کہہ لیجیے۔ قرآن اسے ''حیوٰۃ الدنیا'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ جس سے مراد ہے ایسی زندگی جس میں انسان کی نگاہ قریبی یا پیش پا افتادہ مفاد پر ہی رہے۔ (لفظ دنیا کے معنی ''قریب تر'' کے ہیں) انسان کو اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں بڑی لذت ملتی ہے۔ اگرچہ یہ لذت بڑی سطحی ہوتی ہے) قرآن کی رو سے ان لذات کا حصول بڑی چیز نہیں وہ انہیں وجہ جاذبیت قرار دیتا ہے۔ لیکن اصل سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں اس سطح زندگی کے کسی تقاضے اور ''انسانی قدر'' میں (Tie) پڑتی ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص اس تقاضے کو ترجیح دے کر انسانی قدر کو قربان کر دیتا ہے تو وہ بلندیٔ کردار کا ثبوت نہیں دیتا۔ لیکن اگر وہ انسان قدر کے تحفظ کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے تو اسے کیریکٹر کہا جائے گا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے

اسے کیریکٹر کہیں گے

''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ'' اے ایمان والو! تم عدل و انصاف کی پوری پوری حفاظت کرو۔ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ اگر تمہیں کسی معاملہ میں گواہی دینی پڑے تو اپنے اور بیگانے سب کے خیال سے بلند ہو کر صرف اللہ کے لیے شہادت ہو۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ خواہ یہ شہادت خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف۔ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ اس کا بھی خیال نہ کرو کہ جس کے حق میں تمہاری شہادت جا رہی ہے وہ امیر ہے یا غریب۔ قانون خداوندی، امیر اور غریب دونوں کا سب سے زیادہ محافظ ہے۔ لہٰذا خدا کا حق سب پر فائق ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ دیکھو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اپنے مفاد، رشتہ داری کے تقاضے یا دولت مندی کی وجاہت کا خیال، تمہیں انصاف سے روک دے۔ اس باب میں تم اپنے کسی جذبے کی پروا مت کرو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (4/135) ایسا بھی نہ ہو کہ تم شہادت دیتے وقت کوئی گول مول یا پیچدار بات کہو یا ویسے ہی ٹال جاؤ۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔''

آپ دیکھئے کہ یہاں حیوانی اور انسانی اقدار میں کس طرح (Tie) پڑتی ہے۔ عدل کی پاسبانی اور اس کے لیے سچی شہادت مستقل اقدار میں سے ہیں۔ اس کے برعکس، مفاد خویش، اعزاء و اقرباء کے تعلقات کا خیال، فریق مخالف کی دولت اور وجاہت کے اثرات کا تصور، قدم قدم پر عناں گیر ہو رہا ہے کہا گر سچی گواہی دی تو یہ نقصان ہوگا۔ وہ ضرر پہنچے گا۔ لیکن ان تمام نقصانات کا تعلق انسان کی طبعی زندگی سے ہے۔ اس کش مکش میں جو شخص ان طبعی تقاضوں کو ترجیح دے کر جھوٹی شہادت دیتا

[1] The Theory of Good and Evil, Vol. II, P311

ہے یا شہادت دینے سے پہلوتہی کرتا ہے۔ اس کا کیریکٹر پست ہے۔ (قرآن اسے اتباعِ ہویٰ سے تعبیر کرتا ہے) ہویٰ کے بنیادی معنوں میں پستی کی طرف لے جانے کا مفہوم ہے) لیکن جو شخص ان تمام امیال وعواطف کو نظر انداز کر کے حق کی گواہی دیتا ہے وہ بلند کردار کا حامل ہے۔ حیوانی جذبات اور انسانی اقدار کی یہ جنگ زندگی کے ہر دوراہے پر ہوتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ان دوراہوں پر آپ کا قدم کس طرف اٹھتا ہے۔

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ انسان اپنے طبعی (حیوانی) تقاضے کو قربان کر کے انسانی اقدار کی حفاظت کیوں کرے؟ طبعی تقاضوں میں بڑی کشش وجاذبیت ہوتی ہے۔ دولت، ثروت، عیش وآرام کی زندگی۔ عزت اور نام کی شہرت۔ بلند مناصب ومدارج، قوت اقتدار، حکومت۔ ان سب میں بڑی جاذبیت ہے۔ ان کے مقابلہ میں انسانی اقدار کے تحفظ میں کونسی لذت یا منفعت ہے۔ جس کی خاطر انسان ان تمام مفاد ومنافع اور لذات وحظاظ کو قربان کر دے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور جب تک اس کا اطمینان بخش جواب سامنے نہ آئے انسان اس قدر منافع ولذات کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوسکتا۔ آج دنیا میں جو اس قدر کیریکٹر کا فقدان نظر آتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ انسان مفاد پرست واقع ہوا ہے۔ ذاتی مفاد کا خیال اس کے دل سے نکالا نہیں جاسکتا۔ (مفاد خویش کا تحفظ درحقیقت جذبہ تحفظِ خویش ہی کی شاخ ہے) وہ مفاد خویش کی خاطر انسانی اقدار کی اس لیے پروا نہیں کرتا کہ اسے ان اقدار کی نگہبانی میں اپنا کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے اس امر کا یقین ہوجائے کہ انسانی اقدار کا تحفظ، حیوانی تقاضوں کی تسکین کے مقابلے میں زیادہ منفعت بخش ہے تو وہ یقیناً ان اقدار کے تحفظ کے لیے وہ سب کچھ کر گزرے گا جو وہ آج اپنے حیوانی مفاد کے تحفظ کے لیے کرتا ہے۔۔۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔۔۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے سمجھیے۔

ایک شخص کئی دنوں کا بھوکا ہے۔ اتنا بھوکا کہ نقاہت کی وجہ سے اس سے اٹھا تک نہیں جاتا۔ اتنے میں ایک آدمی، گرم گرم پلاؤ کا قاب اس کے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس قاب پر جھپٹ پڑے گا۔ وہ جلدی سے لقمہ اٹھاتا ہے اور اسے منہ کے قریب لے جاتا ہے کہ دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ اس پلاؤ میں اور تو ہر چیز نہایت عمدہ اور خالص ہے لیکن غلطی سے اس میں نمک کی جگہ سنکھیا پڑ گیا ہے۔

آپ کیا کیا خیال ہے کہ یہ سننے کے بعد وہ اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دے گا؟ وہ یقیناً قاب اٹھا کر پھینک دے گا، وہ اس پلاؤ کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اسے یقین ہے کہ اس کے کھانے سے اس کی موت واقع ہوجائے گی۔ وہ بھوک کی تکلیف اور زندگی کے زیاں کا مقابلہ کرے گا اور اپنا فائدہ اسی میں دیکھے گا کہ بھوک کی تکلیف برداشت کر لے لیکن اپنی جان ضائع نہ کرے۔

اب اسی مثال میں اتنی سی تبدیلی کر لیجیے کہ جب اس نے پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تو دوسرے شخص نے کہا کہ بھئی! یہ پلاؤ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ہے حرام کی کمائی کا۔ اب سوچیے کہ وہ شخص اس لقمہ کو منہ میں ڈال لے گا یا قاب اٹھا کر باہر پھینک دے

گا؟ وہ پلاؤ ضرور کھالے گا اور اس بات کی ہزار تاویلیں کرلے گا کہ وہ ناجائز کمائی کا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ اسے پلاؤ کھالینے میں تو اپنا فائدہ نظر آتا ہے لیکن اسے چھوڑ دینے میں کوئی فائدہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر اسے یقین ہوتا کہ اس پلاؤ کے کھانے سے بھی اس کی ہلاکت ہوجائے گی تو وہ اسے اسی طرح اٹھا کر پھینک دیتا جس طرح اس نے سنکھیا والے پلاؤ کو اٹھا کر پھینک دیا تھا۔

سوال سارا یہ ہے کہ جب جسم کے کسی تقاضے اور انسانی قدر میں تصادم ہوجائے، اگر اس وقت انسان کو یہ یقین ہو کہ اس قدر کی حفاظت میں اس کا زیادہ فائدہ ہے تو وہ یقیناً اس کے تحفظ کے لیے جسم کے تقاضے کو قربان کردے گا۔ آیئے دیکھیں کہ اس مقصد کے لیے عام طور پر کیا کہا جاتا ہے اور قرآن اس اہم گتھی کو کس طرح سلجھاتا ہے۔ اخلاقیات کا سارا راز اسی میں ہے۔

مذہب پرست طبقہ کی طرف سے جواب

جن لوگوں کے نزدیک انسانی اقدار اپنا وجود ہی نہیں رکھتیں، سردست انہیں چھوڑیئے اور ان کی طرف آیئے جو ان اقدار کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ایک طبقہ وہ ہے جسے عام طور پر ''مذہب پرست'' یا خدا پرست کہا جاتا ہے۔ (اسلام دین ہے مذہب نہیں، اس لیے اسلام کا شمار مذاہب میں نہیں ہوتا لیکن اسے اب مذہب ہی سمجھا جاتا ہے) ان کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جن امور کو انسانی اقدار کہا جاتا ہے وہ خدا کے احکام ہیں۔ ان کی اطاعت سے خدا خوش ہوجاتا ہے اور اگر اس کے احکام کو نہ مانا جائے تو وہ ناراض ہوجاتا ہے اور مرنے کے بعد جہنم میں ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا انسان کو خدا کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہنا چاہیے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔

ظاہر ہے کہ اس انداز کے جواب سے انسان اس زمانے میں تو مطمئن ہوسکتا تھا، جب اس کا ذہن ہنوز عہد طفولیت میں تھا، لیکن اب یہ جواب اس کے لیے وجہ طمانیت نہیں ہوسکتا۔ آپ ایک بچے سے تو ڈرا دھمکا کر اپنا حکم منوا سکتے ہیں بڑے آدمی سے نہیں منوا سکتے۔ بڑا آدمی اگر بعض حالات میں اس کے لیے آمادہ ہو بھی جائے تو بھی اس کا دل اس کے خلاف بغاوت کرتا رہے گا اور اس موقع کی تلاش میں رہے گا کہ وہ ڈر کے بندھنوں کو توڑ کر آزاد ہوجائے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جو بات محض کسی کے ڈر سے کی جائے اس میں کیریکٹر کی بلندی کا کیا سوال؟ اگر کوئی شخص گرفتاری کے ڈر سے چوری نہیں کرتا تو اسے صاحب کردار نہیں کہا جائے گا۔ لہٰذا مذہب پرست طبقہ کا یہ جواب، اس مقصد کے حصول کے لیے اطمینان بخش ثابت نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مذہب کی گرفت دلوں پر سے ڈھیلی پڑ رہی ہے۔

مفکرین کا طبقہ

دوسرا طبقہ مفکرین کا ہے۔ اس باب میں ان کا کیا خیال ہے، اس کے متعلق بہت سے مفکرین مغرب کے اقوال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس سے بات لمبی ہوجائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم اس ضمن میں ایک آدھ مفکر کا نظریہ پیش کردیں تو مقصد پیش نظر کے لیے وہی کافی ہوگا۔ مغربی مفکرین میں جو مقام کانٹ کو حاصل ہے وہ ارباب فکر سے پوشیدہ نہیں۔۔۔ کانٹ

کے نزدیک اخلاقیات کی ساری عمارت انسان کے نیک ارادے (Good will) کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے وہ کہتا ہے کہ:

اس دنیا میں بلکہ اس سے باہر بھی کوئی چیز ایسی نہیں جسے بلا مشروط خیر محض کہا جا سکے، سوائے نیک ارادے کے۔

اور نیک ارادے کی تعریف (Definition) کانٹ کے نزدیک یہ ہے کہ:

وہ ارادہ جو کسی کام کو محض اس لیے کرتا ہے کہ اس کا کرنا فرض (Duty) ہے۔

یعنی ہر قسم کے افادی تصور سے بے نیاز ہو کر فرض کو محض فرض سمجھ لینا، کرنا، نیک ارادہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس عمل میں (خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو) ذرہ بھر بھی صلہ کی اُمید یا معاوضہ کا تصور شامل ہو جائے وہ عمل، عمل خیر نہیں رہتا۔ اس کے نزدیک عمل خیر کی قیمت وہ اصول ہوتا ہے جس کے مطابق وہ عمل میں آتا ہے۔ اس نظریہ کے تحت کانٹ کے نزدیک۔ اصول بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کو کسی مقصد کے حصول کے لیے آمادہ عمل کریں۔ انہیں کانٹ مادی اصول (Material Maxims) قرار دیتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی مقصد کے تصور کے بغیر آمادہ عمل کریں۔ ان کا نام، ان کی اصطلاح میں (A Priori Maxims) ہے۔ اس کے نزدیک یہ اصول انسان کے اندر، فرض (Duty) کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے اصول کو وہ امر غیر مشروط (Imperative Categorical) کہہ کر پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

امر غیر مشروط سے مفہوم یہ ہے کہ اس سے ایسا کام ظہور میں آئے جس سے کسی مقصد کا حصول مقصود نہ ہو، بلکہ وہ کام اپنی ذات میں واجب العمل ہو۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے اگر عام فہم الفاظ میں بیان کیا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ انسانی اقدار انسان کے فرائض ہیں۔ انہیں انسان کو فریضہ سمجھ کر ادا کرنا چاہیے۔ نہ کہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ۔ ان کے ''فرائض'' ہونے کے لیے نہ کوئی دلیل دی جا سکتی ہے۔ (A Priori) کے یہی معنی ہیں۔ اور نہ ہی ان فرائض کی سرانجام دہی سے کسی صلہ یا معاوضہ کی توقع رکھنی چاہئے۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ فکری طور پر کتنا ہی بلند آہنگ اور خوش آئند کیوں نہ ہو، انسان کے دل میں ایسا جذبہ نہیں ابھار سکتا جس سے وہ مادی مفاد اور طبعی لذات کو قربان کر کے۔ انسانی اقدار کے تحفظ کے لیے آمادہ عمل ہو جائے۔ اس کے لیے کسی بہت بڑے جذبہ محرکہ کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ انسان ''مفاد خویش'' کے خیال سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ یہ (ذہنی اور قلبی طور پر مطمئن ہو کر) کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا۔ جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ یہ وجہ ہے کہ دنیا میں نہ فلاسفرز کے بلند آہنگ نظریات اور نہ تارک الدنیا ارباب تصوّف کے کیف آور پند و نصائح انسانوں کو ''مفاد خویش'' سے بے نیاز کر کے مستقل اقدار کے محافظ بنا سکنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی کامیابی زیادہ سے زیادہ چند افراد تک محدود رہی ہے۔ زندگی کا مسلک نہیں بن سکی۔ ان میں زندگی کا عالمگیر مسلک بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ زندگی کا عالمگیر نظریہ اور مسلک بننے کی صلاحیت صرف اس اصول میں ہے جسے قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔

قرآن کی رو سے زندگی کے دو نظریے

قرآن کہتا ہے کہ زندگی کے متعلق دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ انسان حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس طبعی زندگی ہے۔ یہ طبعی قوانین کے ماتحت زندہ رہتا ہے اور انہی قوانین کے تابع ایک دن اس کے جسم کی مشینری چلتے چلتے بند ہو جاتی ہے، اسے موت کہتے ہیں اور موت کے ساتھ اس فرد کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور زندگی کے مطابق انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا اور انسان کے سب تقاضے حیوانی سطح زندگی کے تقاضے رہ جاتے ہیں۔ اس میں انسانی اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ انسانوں کو مل جل کر رہنا ہے اور اس طرح رہنے سے ان کے حیوانی تقاضوں کی تسکین میں ایک دوسرے سے تصادم ہو جاتا ہے۔ اس لیے سوسائٹی ایسے قوانین وضوابط مرتب کرتی ہے جو اس کے تابع رہتا ہے اسے پرامن شہری کہا جاتا ہے جو ان کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ عدالت میں سزا پاتا ہے یا سوسائٹی کی نظروں سے گر جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور حیات کی رو سے۔

(i) سوسائٹی کے پاس کوئی مستقل اقدار یا اصول نہیں ہوتے۔ وہ جس قسم کے قوانین وضوابط مناسب سمجھے وضع کر لے اور جب چاہے ان میں تغیر وتبدل یا حک واضافہ کر لے۔

(ii) ان قوانین وضوابط کے اتباع کے لیے جذبہ محرکہ صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے عدالت سے سزا مل جائے گی یا انسان سوسائٹی کی نظروں سے گر جائے گا۔ لہٰذا:

(iii) اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر لے لیکن عدالت کی گرفت میں نہ آئے یا سوسائٹی اس کا محاسبہ نہ کرے تو پھر اسے ان قوانین کی پابندی کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

(iv) اس سوسائٹی میں کیریکٹر کی بلندی کا معیار صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان ذاتی مفاد کو قوم اور ملک کے مفاد پر ترجیح نہ دے۔ ان کے ہاں قوم فروشی، قانونی جرم بھی ہوتا ہے اور سوسائٹی کی نظروں میں معیوب بھی۔ لیکن اگر کسی ملک میں قانونی نظام کمزور ہو جائے اور مفاد خویش کا جذبہ ایسا عام ہو جائے کہ سارے کا سارا ملک اس رو میں بہہ نکلے تو پھر نہ کوئی قوت ایسی رہتی ہے جو افراد قوم کو اس لوٹ کھسوٹ سے باز رکھ سکے اور نہ کوئی جذبہ محرکہ ایسا جو ان کے اندر کیریکٹر کے احساس کو بیدار کر سکے۔ اس وقت دنیا جس جہنم میں سے گزر رہی ہے اس کی وجہ، زندگی کا یہی تصور ہے۔ اسے سیکولر نظریہ حیات کہا جاتا ہے۔ جن قوموں میں قومی مفاد کا شعور بیدار ہے وہ اپنی قوم سے باہر کے انسانوں کے لیے عذاب بن رہی ہیں۔ اور جن میں یہ شعور بھی باقی نہیں رہا وہ ایسے جذام میں مبتلا ہیں جس سے وہ اپنے آپ سے بھی نالاں ہیں اور ساری دنیا بھی اس سے نفرت کرتی ہے۔

کیریکٹر کی اس تعریف (Definition) کی رو سے، جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس تصور حیات کے مطابق کسی شخص میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں ہر انسان (یا انسانوں کا گروہ) اپنے طبعی مفاد کو سامنے رکھتا ہے۔ جب دو (طبعی) مفادات میں ٹکراؤ پیدا ہو تو وہ دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور زیادہ فائدے کو تھوڑے فائدے پر ترجیح دیتا ہے۔ اسے آپ

منفعت اندیشی کہیں گے۔ کیریکٹر نہیں کہیں گے۔ حتیٰ کہ اس تصور کے ماتحت اگر کوئی شخص قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتا ہے تو وہ بھی اپنے ایک زیادہ قیمتی طبعی تقاضے کو کم قیمتی طبعی تقاضے پر ترجیح دیتا ہے۔ (تفصیل اس کی آگے چل کر پیش کی جائے گی۔)

◆◆◆

دوسرا تصورِ حیات:

یہ تھا ایک تصورِ زندگی اور اس کے نتائج و عواقب۔ قرآن کی رو سے دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسان اس کے جسم ہی سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات (Human Personality) یا نفس کہتے ہیں۔ انسانی زندگی کا مقصد اس کی ذات کی نشوونما ہے۔ چونکہ اس کی نشوونما کے لیے جسم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ ساتھ جسمانی نشوونما بھی ضروری ہے۔ لیکن جسمانی نشوونما، ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ مقصود بالذات انسانی ذات کی نشوونما ہی ہے۔

آپ کسی انسان کے دل کو ٹٹولئے اور دیکھیے کہ اس کی عمیق ترین آرزو اور شدید ترین تمنا کیا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ انسان کی سب سے زبردست خواہش یہ ہے کہ وہ زندہ رہے۔ کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ تحفظِ خویش اس کی جبلت کا تقاضا ہے اور اس کی عقل وہ تمام سامان و ذرائع بہم پہنچاتی ہے جس سے اس کا یہ مقصد پورا ہوتا رہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے قرآن نے قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابلیس نے انسان کے اس کمزور پہلو کو بھانپا۔ وہ اس کے پاس گیا اور نہایت مشفقانہ انداز میں کہا کہ کیا تمہیں ایک ایسا نسخہ بتاؤں جس سے تمہیں حیاتِ جاوید حاصل ہو جائے اور ایسا اقتدار مل جائے جسے کبھی زوال نہ ہو؟ یہ آدم (آدمی) کے دل کی خواہش تھی۔ وہ لپک کر آگے بڑھا اور ابلیس سے کہا کہ مجھے ضرور ایسا نسخہ بتاؤ۔ ابلیس نے کہا کہ تم اپنے مرنے کے بعد اپنی اولاد کے ذریعہ زندہ رہ سکتے ہو۔ اس سے تمہارے نام کو حیاتِ دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ ابلیس کا یہ افسوں کس درجہ کارگر ہوا، اس کا ثبوت روزمرہ کی زندگی میں قدم قدم پر مل سکتا ہے۔ جس عمر رسیدہ آدمی کے ہاں اولاد (بالخصوص نرینہ اولاد) نہیں ہوتی، دیکھیے کہ وہ بیٹے کی پیدائش کے لیے کس قدر تڑپتا ہے۔ وہ ہر سانس میں کہتا ہے کہ اگر میں اسی طرح مر گیا تو میرے گھر کا چراغ گل ہو جائے گا۔ میرا نام و نشان مٹ جائے گا۔ میرے نسب کا شجرہ منقطع ہو جائے گا۔ میرے خاندان کی جڑ کٹ جائے گی۔

لیکن خدا نے انسان سے کہا کہ یہ ابلیس کا فریب ہے۔ یہ مادی تصورِ حیات کا افسوں ہے۔ باپ کی زندگی اپنی ہے۔ اولاد کی اپنی، اولاد کے زندہ رہنے سے باپ کو حیاتِ جاوید نہیں مل سکتی۔ حیاتِ جاوید حاصل ہونے کا طریقہ کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان کی طبعی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔۔۔ انسان کو حیاتِ جاوید، انسانی ذات کی نشوونما سے مل سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:

زندگانی ہے صدف، قطرہ نیساں ہے خودی وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

ہواگر خود نگر و خودگر و خود گیر خودی یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مرنہ سکے

پھر قرآن نے یہ بھی بتادیا کہ زندگی کی موجودہ سطح پر ذات کی نشوونما، جسم کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لیے انسانی جسم کا تحفظ اور اس کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے جیسے انڈے میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اگر اس کی مناسب نشوونما ہوجائے تو اس کے اندر مضمر حیات، ایک جیتے جاگتے چوزے کی شکل اختیار کرلے لیکن اس کے لیے انڈے کے خول کا محفوظ اور مضبوط ہونا ضروری ہے۔ لیکن انڈے کا خول بہرحال انڈے کی امکانی صلاحیتوں کے برومند ہونے کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ جونہی وہ مقصد حاصل ہوجاتا ہے۔ یعنی بچہ بن جاتا ہے۔ خول کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ ٹوٹ کر الگ ہوجاتا ہے اور اس کے اس طرح ٹوٹ جانے سے بچہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اسی طرح انسانی جسم، اس کی ذات کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ ذات کی نشوونما کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

اس نے یہ بھی بتادیا کہ جس طرح انسانی جسم کی نشوونما کے لیے طبعی قوانین مقرر ہیں۔ اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لیے بھی کچھ قوانین ہیں۔ ان قوانین کو انسانی اقدار یا مستقل اقدار (Permanent Values) کہتے ہیں۔ یہ اقدار وحی کے ذریعہ ملتی ہے اور اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ جس طرح جسم کی پرورش کے قوانین عالمگیر ہیں اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی عالمگیر ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ جو شخص اس تصور حیات پر ایمان رکھتا ہے اس کی زندگی (اور زاویہ نگاہ) میں اور اس شخص کی زندگی (اور زاویہ نگاہ) میں جو سیکولر تصور حیات رکھتا ہے، کتنا وسیع اور گہرا فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً:

(i) سیکولر تصور حیات کی رو سے انسان کی طبعی زندگی اور تقاضے مقصود بالذات ہوتے ہیں، اس لیے اس کے سامنے نہ طبعی تقاضوں سے بلند کوئی اور تقاضا ہوتا ہے اور نہ ہی طبعی قوانین سے بالاتر کوئی قوانین اور اقدار، لیکن

(ii) قرآنی تصور حیات کی رو سے، انسانی جسم اور اس کے تقاضے، مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ ایک بلند مقصد (استحکام ذات) کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اور دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

(iii) قرآنی تصور حیات کی رو سے جسم کے تقاضوں کی تسکین بھی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن جب کبھی جسم کے کسی تقاضے اور اس کی ذات کے تقاضے (یا طبعی تقاضہ یا مستقل اقدار کے تقاضہ) میں ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ ذات کے تحفظ کے لیے جسمانی تقاضے کو قربان کردیتا ہے۔ اس لیے کہ کوئی صاحب عقل وہوش ذریعے کو بچانے کے لیے مقصد کو قربان نہیں کرتا۔ جب اس شخص نے سنکھیا والے پلاؤ کو پھینک دیا تھا تو ہر چند عام حالات میں کہ پلاؤ، اس کی جان بچانے کا ذریعہ تھا۔ لیکن جب وہ ذریعہ اس کی جان کی ہلاکت کا موجب بن گیا تو اس نے جان کی خاطر ذریعہ کو چھوڑ دیا۔

(iv) قرآن کے تصورِ حیات پر ایمان رکھنے والا، مستقل اقدار کی حفاظت، کسی کا حکم یا فریضہ سمجھ کر نہیں کرتا۔ وہ اس میں اپنا فائدہ دیکھتا ہے۔ وہ طبعی تقاضہ اور مستقل اقدار کے ٹکراؤ کے وقت، دونوں میں موازنہ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان میں سے

کس کے تحفظ میں اس کا زیادہ فائدہ ہے۔ وہ طبعی تقاضا کے تحفظ میں طبعی (لہٰذا عارضی) حیات کا فائدہ دیکھتا ہے اور مستقل قدر کے تحفظ میں، انسانی (لہٰذا دائمی) حیات کا فائدہ۔ لہٰذا خود اس کی عقل کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ فائدہ کی خاطر کم فائدہ کو قربان کر دے۔ اقبالؒ صرف طبعی تقاضوں کا تحفظ کرنے والی عقل کو ''عقل خود بیں'' اور طبعی اور انسانی ذات دونوں کے تقاضوں کا تحفظ کرنے اور ان میں موازنہ کرنے والی عقل کو ''عقل جہاں بین'' کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآن، طبعی تقاضوں کو قریبی زندگی (حیوٰۃ الدنیا) کے مفاد اور انسانی ذات کے تقاضوں کو مستقبل (آخرت) کے مفاد سے تعبیر کرتا ہے اور مومنین کو اولوالالباب کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی بلند سطح کی عقل کے حامل انسان۔

(v) اس سے ظاہر ہے کہ مستقل اقدار کا تحفظ، خود انسان کی عقل کا تقاضہ ہو جاتا ہے۔ انسانی عقل ہمیشہ مفاد خویش چاہتی ہے۔ جب وہ دو مفادات میں موازنہ کرتی ہے تو وہ بڑے فائدے کی خاطر چھوٹے فائدے کو چھوڑ دیتی ہے۔ حیوانی سطح زندگی پر انسان کی عقل کا درجہ پست ہوتا ہے۔ انسانی سطح (یعنی مومن کی سطح) پر اس کا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ مومن کی عقل، بلند سطح کی عقل ہوتی ہے۔ (vi) جو کام عقل خود بیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے (عام اصطلاح کے مطابق) عقل مندی کہا جائے گا۔ لیکن جو کام عقل جہاں بیں کے تقاضے سے کیا جائے اسے عقل مندی اور کردار دونوں کا مجموعہ قرار دیا جائے گا۔ مومن کے ہاں ایمان اور عقل میں قطعاً مغائرت نہیں ہوتی۔ چونکہ سیکولر نقطۂ نگاہ کی رو سے طبعی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی نہیں ہوتی اس لیے ان کی زبان میں عقل خود بیں اور عقل جہاں بیں کے لیے الگ الگ الفاظ ہی نہیں تھے۔ اب ماہرین علم النفس بلکہ علم تجزیہ نفس (Psycho Analysts) نے دو الگ الگ اصطلاحات وضع کی ہیں۔ ایک وہ عقل جو انسان کے طبعی تقاضوں کے حصول اور ان کی تائید میں دلائل فراہم کرے وہ اسے (Rationalising Intellect) سے تعبیر کرتے ہیں اور دوسری وہ عقل جو انسانی نفس کے حق میں دلائل فراہم کرتی ہیں وہ اسے (Reason) کہہ کر پکارتے ہیں۔ اقبالؒ نے ان کے لیے پہلے ہی دو اصطلاحات وضع کر دی تھیں۔ اوّل الذکر کے لیے ''دانش برہانی'' اور ثانی الذکر کے لیے ''دانش نورانی''۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ جب تک انسان اس تصور حیات پر ایمان نہ لائے (اس کی صداقت کا یقین نہ کرے) کہ:

ایمان کی ضرورت

(i) انسان صرف اس کے جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ انسانی ذات بھی ہے جس کی نشوونما مقصود زندگی ہے۔

(ii) ذات کی نشوونما کے لیے اسی طرح قوانین مقرر ہیں جس طرح جسم کی پرورش کے لیے۔ ان قوانین کو مستقل اقدار کہتے ہیں۔

(iii) یہ مستقل اقدار خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں اور

(iv) انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔

اس وقت تک اس کیریکٹر کا سوال ہی سامنے نہیں آتا جس کا تعلق عالمگیر شرف انسانیت سے ہے۔ راشڈل لکھتا ہے کہ

طبعی نقصان تو ہوگا لیکن اس کی ذات کا فائدہ ہوگا۔ وہ طبعی فائدہ اور ذات کے فائدہ میں موازنہ کرے گا اور چونکہ اس کے نزدیک ذات کا فائدہ بہرحال و بہرکیف زیادہ گراں بہا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ زیادہ فائدے کے لیے کم فائدے کو ٹھکرا دے گا۔ آپ نے دیکھا کہ اس ایمان سے انسان کے ''مفاد خویش'' کے جذبہ کی تسکین بھی کسی طرح ہو جاتی ہے۔

مفاد اور مفاد میں فرق

اس وقت اس کا جذبہ محرکہ بھی مفاد خویش ہی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن وہ مفاد اور مفاد میں فرق کرتا ہے۔ وہ طبعی جسم کے فائدے کے مقابلے میں ذات کے فائدے کو زیادہ قیمتی سمجھتا ہے۔ اس لیے کم فائدے سے صرف نظر کر کے زیادہ فائدے کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اس لئے وہ رشوت کی پیش کش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ اس کام کو نہ تو اس لیے کرتا ہے کہ یہ کسی کا ''حکم'' ہے اس لیے اس کی تعمیل ضروری ہے۔ نہ اس لیے کہ ایسا کرنا اس کا فرض ہے۔ وہ اسے اس لیے کرتا ہے کہ ایسا کرنے میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے۔ اس میں ڈر کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ ڈر ہوتا ہے اپنی ذات کے نقصان کا۔۔۔ جس طرح زہر آلود پلاؤ کھانے والے کو ڈر ہوتا ہے اپنی جان کی تباہی کا۔۔۔ اسے قرآن کی رو سے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ مرتب ہونا۔

آپ نے غور کیا کہ انسانی ذات پر ایمان انسان کو کس طرح ہر آن حسن عمل (کیریکٹر کے مظاہرہ) پر آمادہ کیے چلا جاتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ایک مردِ مومن حسن عمل کسی صلہ یا معاوضہ کی خاطر نہیں کرتا تو اس سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ وہ عمل کا صلہ یا معاوضہ، طبعی یا حیوانی پیمانوں میں نہیں مانگتا۔ اسے اس کا صلہ ذات کے پیمانوں کے مطابق ملتا ہے۔ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ ۙ (10:72) سے یہی مراد ہے۔ (اس کے معنی یہ نہیں کہ مستقل اقدار کے مطابق عمل کرنے سے طبعی مفاد ملتے ہی نہیں۔ ان اقدار کے مطابق نظام زندگی متشکل کرنے سے اس دنیا کے طبعی مفاد بھی بڑی عمدگی سے حاصل ہوتے ہیں اور انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی ہے۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً کا یہی مفہوم ہے۔ یعنی دنیاوی زندگی بھی خوشگوار اور اخروی زندگی بھی خوشگوار۔

عمل کوئی بھی ہو وہ بلا صلہ یا بلا معاوضہ کبھی نہیں رہتا۔ صرف معاوضہ اور معاوضہ میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً انسانی ذات کی نشوونما کے لیے ایک قانون (مستقل) قدر یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے جس قدر زیادہ دوسروں کی پرورش کے لیے دیتا ہے اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو شخص انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے وہ پوری محنت سے کمائی کرتا ہے۔ لیکن اس میں سے صرف اتنا اپنے لیے رکھتا ہے جس سے اس کی طبعی ضروریات پوری ہوں اور فاضلہ کمائی دوسروں کی پرورش کے لیے عام کر دیتا ہے۔ (قرآن کریم نے انسانی ذات کی نشوونما کا یہ طریق بتایا ہے) ظاہر ہے کہ طبعی پیمانوں سے ماپئے تو اس میں اس شخص کا سراسر نقصان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر کسی شخص کو معلوم ہو کہ جو

مستقل اقدار ماننے کے لیے۔

(1) سب سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ کائنات بلا مقصود نہیں پیدا کی گئی۔ بلکہ اس کی تخلیق سے مقصد یہ ہے کہ یہ وہ سامان فراہم کرے جس سے انسانی ذات منزل مقصود تک جا پہنچے۔

(2) دوسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسانی ذات

(ا) ایک مستقل حقیقت ہے۔

(ب) اس کی اپنی مستقل زندگی ہے۔ یعنی مادی جسم کے تغیرات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

(ج) یہ اپنے تمام افعال کی سبب آپ ہے۔

(3) تیسرے یہ ماننا ضروری ہے کہ انسان کے موجودہ عمل اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں۔ یعنی جس قسم کے اس کے اعمال ''آج'' ہوں گے اسی قسم کا اس کا ''کل'' ہوگا۔ بالفاظ دیگر اس کے لیے تسلسل حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لگا رہے گا اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا۔ اس لیے کہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان، زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ ورنہ جو شخص یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ ہی میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا اسے تعمیر سیرت کے لیے سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔

(4) اور سب سے ضروری یہ کہ خدا پر ایمان لانا ہوگا۔ اس لیے کہ اخلاقی آئیڈیل نفس (Mind) کے علاوہ اور کہیں موجود ہی نہیں ہو سکتا اور ایک مطلق اخلاقی آئیڈیل، نفس مطلق میں ہی موجود ہو سکتا ہے۔ جو ہر حقیقت کا سرچشمہ ہے۔ (ایضاً، ص: 220-200)

آپ نے غور کیا کہ کیریکٹر کے لیے ایمان، کس قدر لاینفک شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن ہر جگہ '' عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ '' سے پہلے '' الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا '' کہتا ہے۔

اب آپ اس نکتہ کی طرف پھر آجایئے جسے ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ایسے کام کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ دو شخص دفتر میں کام کرتے ہیں۔۔۔ اس لیے کہ اس سے انہیں تنخواہ ملتی ہے۔ اس میں ان کا فائدہ ہے۔۔۔ ایک کاروباری آدمی کچھ خلاف قاعدہ مراعات حاصل کرنے کے لیے ایک اچھی خاصی رقم بطور رشوت پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں ایک شخص انسانی ذات پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ رشوت کی رقم فوراً قبول کرے گا۔ بشرطیکہ اسے اطمینان ہو جائے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ وہ رشوت اس لیے لے لے گا کہ اس میں اس کا مالی فائدہ ہے۔۔۔ وہ شخص جو انسانی ذات پر ایمان رکھتا ہے کبھی رشوت قبول نہیں کرے گا اس لیے کہ اسے دیانتدار رہنے میں فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ رشوت لینے سے اسے طبعی فائدہ ہوگا، لیکن اس کی ذات کا نقصان ہوگا۔ دوسری طرف رشوت نہ لینے سے اس کا

کچھ اس کی ضروریات سے زائد ہوگا وہ دوسروں کے پاس چلا جائے گا تو وہ اتنا کمائے گا ہی کیوں جو اس کی ضروریات سے زائد ہو۔ وہ تھوڑی سی محنت کر کے اپنی ضروریات کے مطابق کمائے گا اور پھر چین سے سوئے گا۔ ان لوگوں کی یہ دلیل بڑی معقول نظر آتی ہے اور اس کا اطمینان بخش جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی وہ مشکل ہے جو کمیونسٹ ممالک میں پیش آ رہی ہے۔

روس کی مشکل

اس سوال کا جواب صرف قرآنی تصورِ حیات کی رو سے مل سکتا ہے اور یہی ہے وہ مقام جہاں قرآنی نظام، دیگر نظام ہائے معیشت و معاشرت سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ قرآن نظام کی حامل، مومنین کی جماعت ہوتی ہے۔ یعنی ان لوگوں کی جماعت جو اس حقیقت پر اعلیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں کہ:

(i) انسانی ذات کی نشوونما مقصودِ حیات ہے اور

(ii) ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے کہ انسان پوری پوری محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد جس قدر ہو اسے نوعِ انسان کی پرورش کے لیے عام کر دے۔

ان لوگوں کے دل میں اس کے لیے کس قدر تڑپ ہوتی ہے۔ ہم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ جو ماں اپنے دودھ سے بچے کی پرورش کرتی ہے اس کی انتہائی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ دودھ پیدا ہوتا کہ اس کا بچہ بھوکا نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا دودھ اس غذا سے بنتا ہے جو وہ اپنے جسم کی پرورش کے لیے کھاتی ہے۔

مومن ایسا کیوں کرتے ہیں؟

لیکن وہ کبھی نہیں چاہتی کہ یہ غذا اس کے بدن کا جزو بن جائے اور دودھ میں تبدیل نہ ہو۔ اس کے برعکس، اگر کبھی اس کے دودھ میں کمی واقع ہو جائے تو وہ ڈاکٹر سے مشورہ کرتی ہے کہ کس طرح اس کی غذا (زیادہ سے زیادہ حد تک) دودھ میں تبدیل ہو جائے۔ وہ یہ سب کچھ کیوں کرتی ہے؟ محض اس لیے کہ بچے کی حفاظت اور پرورش اس کی زندگی کا مقصد بن چکی ہوتی ہے۔ اس سے اس کے قلب کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کا ایمان یہ ہو کہ دوسروں کی پرورش سے ان کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ کماتے ہیں اور اس سے صرف اپنی ضروریات کے بقدر رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لیے عام کر دیتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات وہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ (59:9) دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی میں گزارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ جس طرح مامتا کی ماری ماں خود بھوکی رہتی ہے لیکن اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر کرتی ہے۔ خود گیلے بستر پر سوتی ہے اور بچے کو خشک جگہ پر لٹاتی ہے۔ جس طرح اس کے دل میں اس وقت کسی معاوضہ یا صلہ کا خیال نہیں

ہوتا۔اسی طرح یہ لوگ بھی جن کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ان سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (76/9) ہم تم سے نہ کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں، نہ شکریہ تک کے متمنی۔اس مثال میں فرق یہ ہے کہ ماں بچے کے لیے یہ کچھ اس جبلی تقاضے کے ماتحت کرتی ہے جو ہر حیوان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ ہر حیوانی ماں بھی وہی کچھ کرتی ہے جو انسانی ماں کرتی ہے۔لیکن بندۂ مومن یہ کچھ عقل وفکر کی رو سے اور اپنے اختیار وارادہ سے کرتا ہے اور ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر قرآن اپنے اس نظام کی عمارت استوار کرتا ہے جس میں کیریکٹر خود بخود بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ سب سے پہلے مملکت کو اس کا ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان فراہم کرے۔

عملی طریق

اس سے انسانی سیرت کی وہ تمام کمزوریاں رفع ہوجاتی ہیں جو احتیاج کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں اور جو کیریکٹر کی پستی کا موجب بنتی ہیں۔ دوسری طرف وہ ہر فرد معاشرہ کے دل میں اس ایمان کو راسخ کرتا ہے (وہ راسخ کیا کرتا ہے۔معاشرہ مشتمل ہی ان افراد پر ہوتا ہے جو اس ایمان کے حامل ہوں) (وہ نظام بچوں کی تعلیم وتربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ ان کے دل میں شروع سے یہ تصور راسخ ہوتا چلا جائے) کہ وہ جس قدر محنت کر کے کمائیں گے اور جو کچھ ان کی ضروریات سے زائد ہوا سے دوسروں کی نشوونما کے لیے دے دیں گے۔اسی قدر ان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہوجاتی ہیں جو دولت جمع کرنے کی ہوس یا افراط زر سے پیدا ہوتی ہیں۔اس نظام میں نہ فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہے نہ مفاد پرستی کے جذبات انسانی سیرت کو داغدار کرتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں کمیونزم کے نظام کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ فاضلہ دولت (Surplus Money) افراد کے پاس نہیں رہنے دے گا اور اس طرح نظام سرمایہ داری کی لعنتوں کو ختم کر دے گا۔ لیکن کمیونزم کا نظام مادی تصور حیات پر مبنی ہے۔اس لیے اس میں وہ جذبہ محرکہ پیدا نہیں ہوسکتا جس کی بنا پر انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اپنی ضروریات سے زائد سب کچھ دوسروں کی پرورش کے لیے بطیب خاطر دے دے۔

کمیونزم کی بنیادی کمزوری

یہی وہ بنیادی کمزوری ہے جس کی وجہ سے کمیونزم کا نظام نہ قائم رہ سکتا ہے، نہ آگے بڑھ سکتا۔اسے صرف استبداد کے زور پر قائم رکھا جاسکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ استبداد کے ڈنڈے سے قائم کردہ نظام، زیادہ دنوں تک چل ہی نہیں سکتا۔ وہی نظام قائم رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے جو افراد معاشرہ کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ یہ چیز قرآن کے پیش کردہ تصور حیات کے علاوہ اور کہیں ممکن نہیں۔کمیونزم جس تصور حیات کی تخلیق ہے اسے قرآن (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے۔جس میں کیریکٹر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس تصور حیات کی رو سے مادی مفاد

سے بلند کوئی قدر نہیں ہوتی۔

نیشنلزم کا جذبہ

اس میں آپ زیادہ سے زیادہ نیشنلزم کا جذبہ ابھار ابھار کر، افراد معاشرہ کو انفرادی مفاد سے قومی مفاد کی طرف لے جاسکتے ہیں۔لیکن چونکہ (مغربی نظریہ جمہوریت کی رو سے) نیشنلزم کی بنیاد قوموں کے باہمی جذبہ منافرت پر ہے اور ایک قوم جانتی ہے کہ اگر مجھ میں کمزوری آ گئی تو قومیں مجھے ہڑپ کر جائیں گی۔اس لئے جس چیز کو نیشنلزم میں قومی کردار کہا جاتا ہے وہ بھی تحفظ خویش (Preservation of Salf) ہی کے جذبہ کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔کسی انسانی قدر کو حیوانی تقاضے پر ترجیح دینے کا نام نہیں ہوتا۔اس میں ایک فرد کے بجائے، افراد کا مجموعہ اپنا تحفظ چاہتا ہے۔ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ تحفظ خویش اچھی چیز نہیں اور کسی قوم کو اپنے ملک کی حفاظت نہیں کرنا چاہیے۔تحفظ خویش نہایت ضروری ہے اور اپنے وطن کی حفاظت تحفظ خویش کے لیے لاینفک۔جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تحفظ خویش کے لیے (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) کوشش کرتا ہے تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ کسی بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔اس کے متعلق یہ ہی کہنا چاہئے کہ وہ عقل مندی اور دانش اطواری کا ثبوت دیتا ہے۔اسی طرح جو شخص اپنا تحفظ نہیں چاہتا (خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی) اس کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا کیریکٹر پست ہے۔کہا یہ جائے گا کہ وہ بڑا احمق ہے۔یہ ایسے ہی ہے جیسے اگر کوئی شخص کشتی میں بیٹھا ہوا، کشتی میں سوراخ کر رہا ہو تو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں کیریکٹر کی کمی ہے۔اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ وہ پاگل ہے۔جو شخص وطن میں رہتے ہوئے اس وطن کی تخریب چاہتا ہے، اس کا شمار پاگلوں میں ہوگا۔لہٰذا نیشنلزم میں اگر کوئی شخص وطن کے مفاد کو، مفاد خویش پر ترجیح دیتا ہے تو اسے نہایت سمجھدار اور ہوشمند کہا جائے گا۔(جس طرح اگر کوئی شخص کشتی کا سوراخ بند کرنے کے لیے اپنا قیمتی رومال اس میں ٹھونس دے تو اسے عقلمند کہا جائے گا) صاحب کردار وہ ہوگا جو کسی ڈوبتے کو بچانے کے لیے دریا میں کود جائے اور یہ چیز صرف بلند اور مستقل اقدار پر ایمان لانے سے پیدا ہوسکتی ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ بعض افراد ایسے بھی ملیں گے جنہیں بلند اقدار کا احساس وشعور بھی نہیں ہوگا لیکن اس کے باوجود وہ ڈوبتوں کو بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔لیکن ان کے نفسیاتی تجزیہ کے بعد یا تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ وہ اس بلند قدر کا غیر شعوری طور پر احساس رکھتے تھے اور یا ان کا جذبہ محرکہ کچھ اور تھا۔صاحب کردار وہی ہے جو دو اقدار کا شعوری طور پر موازنہ کرے اور پھر بلند قدر کی حفاظت کے لیے اس سے پست درجہ کی قدر کو علیٰ وجہ البصیرت قربان کردے۔یہ چیز قرآن کی بیان کردہ مستقل اقدار پر ایمان لانے سے ہی ہوسکتی ہے۔یہ کمیونزم یا کسی اور کے بس کی بات نہیں۔قرآن پر ایمان رکھنے والے اگر اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ذاتی مفاد کی پروا نہیں کرتے تو اس لیے نہیں کہ ملک کے تحفظ سے ان کا اپنا تحفظ ہوجائے گا بلکہ اس لیے کہ وہ ملک کو ان بلند اقدار کے بروئے کار لانے اور دنیا میں عملاً

نافذ کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

مردِ مومن کا جذبہ تحفظ وطن

اور اس کا تحفظ اس لیے چاہتے ہیں کہ اس سے مستقل اقدار کا تحفظ ہوجاتا ہے۔ اس لیے اگر وہ ملک کی حفاظت واستحکام کے لیے ذاتی مفاد کی پروانہیں کرتے تو ان کا یہ عمل بھی اپنے طبعی تقاضے پر مستقل اقدار کو ترجیح دینے کے لیے ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ان کے کیریکٹر کی بلندی کی دلیل ہوتا ہے۔

آپ نے غور کیا کہ ایک مادہ پرست کے جذبہ تحفظ وطن اور ایک مومن کے جذبہ تحفظ وطن میں کس قدر بنیادی فرق ہے۔ مادہ پرست کے نزدیک وطن مقصود بالذات ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت مضمر ہوتی ہے۔ لیکن مردِ مومن کے نزدیک وطن مقصود بالذات نہیں ہوتا ہے کیونکہ اس میں اس کی اور اس کی اولاد کی حفاظت مضمر ہوتی ہے۔ لیکن مردِ مومن کے نزدیک وطن مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک وہ مستقل اقدار کے تحفظ وتنفیذ کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سے اس کا اور اس کی اولاد کا تحفظ بھی ہوجاتا ہے۔ جس طرح قرآنی نظام میں انسانی ذات کے استحکام کے ساتھ ساتھ دنیاوی مفاد بھی حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ جو شخص مستقل اقدار پر ایمان رکھتا ہے اس کے نزدیک مقصود زندگی ان اقدار کا تحفظ ہے۔ باقی سب کچھ اس بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ جب وہ ان ذرائع کے تحفظ واستحکام کی خاطر اپنے طبعی تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو وہ درحقیقت ان مستقل اقدار کے تحفظ واستحکام کے لیے ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مومن کے دنیاوی کام بھی دین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مملکت پاکستان کے حصول کا مقصد یہی تھا کہ اس میں ایسا نظام زندگی قائم کیا جائے جس سے افرادِ معاشرہ کی ذات کی نشوونما ہوجائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس مملکت کا حصول مقصود بالذات نہیں تھا۔ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اس سے اگر طبعی مفاد (سیاسی، معاشی وغیرہ مفادات) حاصل ہوتے تھے تو وہ اس نظام کا فطری نتیجہ تھے لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام انہی افراد کے ہاتھوں قائم ہوسکتا تھا جن کا زاویہ نگاہ قرآنی ہو۔ یعنی جو انسانی ذات اور اس کی نشوونما کو اپنی زندگی اور اس مملکت کا مقصود ومنتہیٰ سمجھیں۔ مملکت کے اقتدار کا اس پارٹی یا اس پارٹی کے ہاتھ میں ہونے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس میں فیصلہ کن سوال یہ ہے کہ کیا مملکت کا اقتدار ان افراد کے ہاتھوں میں ہے جو قرآنی تصورِ حیات پر ایمان رکھتے ہیں اور اقدارِ خداوندی پر عمل پیرا ہونے کو زندگی کا مقصد! اگر ایسا نہیں تو حکومتوں کی تبدیلی او رپارٹیوں کے ردوبدل سے وہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہوسکے گا۔ جس کے لیے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔ یہی وہ حضرات ہوں گے جنہیں صاحب کردار (کیریکٹر والے لوگ) کہا جائے گا اور انہی کے برسرِاقتدار آنے سے معاشرہ کی ہر قسم کی برائیوں کا خاتمہ ہوسکے گا۔ یہ چیز مناسب تعلیم وتربیت کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے جو راہ

نما برسر اقتدار آتے رہے ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ساتھ میری راہ رسم تھی۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ ہماری موجودہ قوم جیسی تیسی بھی ہے اس کے ذمے تو صرف یہ فریضہ عائد کیا جائے کہ اس خطہ زمین کو محفوظ رکھیں۔ لیکن آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ قرآنی تصور حیات ان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور اس طرح وہ ایک مثالی صاحب کردار قوم بن کر ابھرے۔ مجھ سے اتفاق تو ان سب نے کیا لیکن (افسوس کہ) عملی قدم کسی نے بھی نہ اٹھایا۔ ہار تھک کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ (محدود پیمانے پر ہی سہی) جو کچھ مجھ سے بن پڑے مجھے خود ہی کرنا چاہیے۔ چنانچہ آج سے دس بارہ سال قبل ایک ایسی درسگاہ کے قیام کا مقصد بنایا گیا جس میں یونیورسٹی کے نصاب کے ساتھ قرآنی تصورات کو پیوست کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے پہلا مرحلہ زمین حاصل کرنے کا تھا۔ زمینداروں سے اپنے طور پر زمین خریدنے کا پہلا معاملہ ہی فریب انگیز ثابت ہوا تو حکومت سے درخواست کی گئی کہ ہمیں قیمتاً زمین (Acquire) کر دے۔ اس کے لیے قریب چار لاکھ روپیہ حکومت کے خزانہ عامرہ میں جمع کرایا گیا۔ یہ اسکیم اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھی کہ حکومت نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو اپنی تحویل میں لے لینے کا فیصلہ کر دیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ درسگاہ (کالج) کے بجائے قرآنک ریسرچ سنٹر قائم کر لیا جائے جس میں فارغ التحصیل طلباء کی تربیت اس نہج پر کی جائے۔ خدا خدا کر کے حکومت کے قواعد و ضوابط کے مراحل طے ہوئے اور زمین کا قبضہ ملنے میں چند ماہ باقی تھے کہ (سابق چیف منسٹر پنجاب) نواب صادق حسین قریشی کو وہ رقبہ پسند آ گیا لیکن چونکہ قاعدے کی رو سے وہ اس زمین کو حاصل نہیں کر سکتے تھے، ہماری ساری اسکیم ہی منسوخ قرار دے دی گئی۔ ہم نے اس کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیا۔ دو سال کی طویل مدت کے بعد (حال ہی میں) اس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا لیکن قریشی صاحب نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کی اجازت کے لیے درخواست گزار دی ہے۔ ان سطور کی تسوید تک پوزیشن یہ ہے۔

اگر ہمیں یہ زمین مل گئی (اور چونکہ موجودہ حکومت نے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی اجازت کا اعلان کر دیا ہے) تو میں اپنی اسکیم کے مطابق درسگاہ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر عمر کے اس آخری حصہ میں میری یہ آرزو پوری جائے تو میں بحضور رب العزت سجدہ ریز ہوں گا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

(طلوعِ اسلام نومبر 1960ء، صفحہ: 17 تا 38)

سانحہ ارتحال

انتہائی دُکھ کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ بزم طلوع اسلام پنج کسی کے دیرینہ رُکن چوہدری مختار احمد (صوفی صاحب) 26 اگست 2016ء کی صبح اس دارفانی سے انتقال فرما گئے۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ میں اراکینِ بزم پنج کسی اور لاہور سے محترم شیخ اللہ دتا صاحب نے شرکت کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور ان کے لواحقین واعزہ واقربا کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ ادارہ مرحوم کے پس ماندگان اور پنج کسی کے احباب کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

عارف محمود کسانہ، سویڈن
arifkisana@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

مومن کسے کہتے ہیں؟

امی جان نانا ابو کہاں ہیں مجھے اُن سے ضروری کام ہے۔ شمائل نے اپنی امی سے پوچھا۔ بیٹا وہ اپنے کمرے میں ہوں گے۔ کیوں تمہیں کیا کام ہے؟ امی نے شمائل سے پوچھا۔ یہ تو میں انہیں ہی بتاؤں گا اور یہ کہہ کر شمائل نانا ابو کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ انوشہ اور یاور بھی اُس کے پیچھے پیچھے نانا جان کے کمرے کی طرف گئے۔ شمائل نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے نانا ابو کو سلام کیا۔ انہوں نے بڑے پیار سے جواب دیا۔ اتنی دیر میں انوشہ اور یاور بھی آ گئے اور انہوں نے بھی نانا ابو کو سلام کیا۔ نانا جان نے انہیں بھی پیار کیا اور بیٹھنے کو کہا۔ شمائل کہنے لگا نانا جان میرے سکول میں تقریری مقابلہ ہو رہا ہے جس کا عنوان ہے مومن کی زندگی۔ مجھے آپ سے اس سلسلہ میں مدد لینی ہے۔ آپ مجھے تفصیل سے بتائیں کہ مومن کسے کہتے ہیں اور مومن کی زندگی کس طرح کی ہوتی ہے تاکہ میں اچھی سی تقریر تیار کر سکوں۔

اچھا تو یہ بات ہے، نانا جان نے کہا۔ بیٹا مومن عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ لفظ امن سے نکلا ہے جس کا مطلب اطمینان، خوف نہ ہونا، تصدیق کرنا اور بھروسہ کرنا ہوتا ہے لہٰذا مومن کا مطلب ہوتا ہے وہ جو دِل کی سچائی کے ساتھ ایمان کو قبول کر لے، دینِ اسلام کے مطابق چلے اور جس پر بھروسہ کیا جا سکے اور دوسروں کے لیے امن اور سلامتی کا باعث ہو۔ مومن، ایمان، مسلم جیسے الفاظ آپ نے سُنے ہوں گے اِن کا مفہوم ایک جیسا ہی ہے۔ اِسی طرح مسلمان اور مومن ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ جب کوئی اسلام کو دین کی حیثیت سے قبول کرتا ہے تو وہ مسلمان کہلاتا ہے اور جب وہ اپنی زندگی اُس کے مطابق گذارتا ہے تو وہ مومن کہلاتا ہے۔ یعنی جو خدا کو ایک مانتا ہے وہ مسلمان ہوتا ہے اور جو خدا کی ہر بات مانتا ہے وہ مومن ہوتا ہے۔

نانا جان قرآنِ مجید میں مومن کے بارے میں کیا کہا گیا ہے۔ انوشہ نے پوچھا۔

بیٹا قرآن پاک میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے مومن کی خوبیوں کے بارے میں بتایا ہے۔ سب سے پہلے یہ کہا ہے کہ مومن وہ ہوتے ہیں جو غائب پر ایمان لاتے ہیں یعنی جو چیزیں اُن کے سامنے نہیں ہوتیں یا جنہیں وہ نہیں دیکھ سکتے مگر اُن کا ذکر قرآن میں موجود ہے اُن پر ایمان لاتے ہیں جیسے مرنے کے بعد کی زندگی۔ اِسی طرح مومن عقل اور فکر سے کام لیتے ہیں، اِس کائنات پر غور و فکر کرتے ہیں، علم حاصل کرتے ہیں۔ انصاف سے کام لیتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے اور سچی بات کرتے ہیں۔ ماپ تول پورا کرتے ہیں، ضرورت مندوں کو اپنی چیزیں دے دیتے ہیں، فضول باتیں نہیں کرتے، نہ تو تکبر

کرتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کی بُرائی کرتے ہیں۔ نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی کرتے ہیں۔ اسی طرح مومن دوسروں کے بُرے نام نہیں رکھتے، نہ کسی پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں اور نہ ہی کسی کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ آپس میں بھائی بھائی بن کر رہتے ہیں۔ جاہل لوگوں سے بحث نہیں کرتے، اگر کوئی امانت دے تو اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ نرم دل ہوتے ہیں لیکن اللہ کے دشمنوں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔

نانا جان کیا مومن غلط کام بالکل نہیں کرتے۔ کیا اُن سے کوئی گناہ کا کام نہیں ہوسکتا۔ اب یاور نے سوال کیا۔

مومن سے غلطی ہوسکتی ہے مگر وہ فوراً توبہ کرتے ہیں اور غلط کام کو چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بڑے گناہوں سے بچتے ہیں۔ وہ زمین پر اکڑ کر نہیں چلتے اور نہ ہی چلّا کر بولتے ہیں۔ وہ لوگوں سے تُرش روئی سے پیش نہیں آتے، حسد نہیں کرتے، اپنی تعریفیں نہیں کرتے رہتے، اچھے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ہمیشہ صاف سیدھی اور دوٹوک بات کرتے ہیں۔ افواہیں نہیں پھیلاتے اور کوئی غلط بات اُن تک پہنچے تو اُسے آگے نہیں پھیلاتے۔ وعدہ پورا کرتے ہیں اور سچی گواہی دیتے ہیں چاہے اُن کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ والدین، رشتہ داروں اور یتیموں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں۔ کسی کے ساتھ احسان کرکے اُسے جتلاتے نہیں بلکہ اُسے احساس بھی نہیں دلاتے۔ خود تنگی میں رہ کر دوسروں کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ اگر کسی نے اُن سے قرضہ لیا ہو تو واپسی کے لیے تنگ نہیں کرتے اور اگر ممکن ہو تو معاف بھی کر دیتے ہیں۔ پہلے اپنی اصلاح کرتے ہیں پھر دوسروں کو تلقین کرتے ہیں۔ اپنے غصہ پر قابو پاتے ہیں، اپنی نگاہ اور ذہن صاف رکھتے ہیں۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی زندگی بغیر کسی خوف کے قرآن کے مطابق بسر کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔

ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ نے بھی مومن کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟ شمائل نے پوچھا۔

حضور پاک ﷺ نے بھی مومن کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ شخص مومن نہیں ہوسکتا جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے محفوظ نہ ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مومن وہ ہے جو چیز اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرے۔ اِسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم اُس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک حضور ﷺ سے سب سے زیادہ پیار نہ کریں۔ جب ہم اُن سے پیار کریں گے تو قرآن کے مطابق زندگی گذاریں گے کیونکہ آپ ﷺ کی پوری زندگی قرآن کے مطابق ہی تھی۔ بچو! آپ کو میں نے مومن کی خوبیاں اور اُس کی زندگی کے بارے میں بتا دیا ہے امید ہے کہ آپ کو سب سمجھ آ گئی ہوگی اور شمائل اب تم اس بارے میں اچھی سی تقریر بھی تیار کر سکتے ہو۔

جی نانا جان جب آپ بتا رہے تھے میں ساتھ ساتھ لکھتا جا رہا تھا اور اب میں بہت اچھی تقریر تیار کروں گا اور مجھے امید ہے کہ پہلا انعام بھی میرا ہی ہوگا!

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تھیوکریسی اور قرآنی ریاست کے درمیانی فاصلے

قرآنِ کریم کی بعض آیات ایسی جامع ہوتی ہیں کہ اگر صرف ایک ہی آیت پر توجہ کر لی جائے، تو قرآنِ کریم کے اعجاز کے ثبوت کے لئے ایک ہی آیت کافی ہوتی ہے ارشاد قرآنی ہے:

وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ (2:216)، ترجمہ: ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاید تم کو کوئی چیز بُری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو، اور شاید تم کو کوئی چیز اچھی لگے اور وہ تمہارے لئے بُری ہو اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ تمہارا علم محدود ہے۔ وہ تمہارے اپنے مفاد کے تابع چلتا ہے۔ خدا کا علم ایک تو بلند ہوتا ہے پھر دوسری بات یہ ہے کہ اس کے سامنے پوری عالمگیر انسانیت کا مفاد ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سو سال پیشتر یہ دعویٰ کیا تھا کہ عقلِ انسانی اس بات پر قادر ہی نہیں ہے کہ وہ خیر و شر کے مسئلہ کو سلجھا سکے اور Good and Evil کو Define کر سکے قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ اب بھی قائم ہے اور قرآن اپنے مؤقف پر جم کے کھڑا ہے اور خیر و شر کا یہ مسئلہ آج تک متنازع ہی چلا آ رہا ہے۔ جس دن سے انسان نے غور و فکر، تعقل و تدبر کرنا شروع کیا تھا یہ مسئلہ ہمیشہ اس کے پیشِ نظر رہا ہے۔ لیکن آج تک اس مسئلہ کا کوئی حل فکرِ انسانی کو نہیں ملا اور قرآنِ کریم کے دعویٰ کے مطابق عقلِ انسانی کو اس کا حل مل بھی نہیں سکتا۔ اس مشکل ترین مسئلہ کا حل قرآن نے تو چند الفاظ میں دے دیا ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک تو کوئی شے فی ذاتہٖ نہ خیر ہوتی ہے اور شر نہ ہوتی ہے۔ ان چیزوں کا استعمال انہیں خیر و شر بناتا ہے۔ اگر وہ نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے استعمال ہوتی ہے جس سے اس شخص کی ذات کو استحکام ملتا ہے تو وہ خیر ہے۔ لیکن اگر وہ نوعِ انسانی کی تخریب کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں فرد متعلقہ کی ذات مضمحل ہوتی ہے تو وہ شر ہے۔ خیر و شر کی اصل اساس ذاتِ انسانی پر اچھے یا بُرے اثرات مرتب ہونا ہے۔ اگر کسی عمل سے انسان کی ذات پر اچھے اثرات مرتب ہو رہے ہیں تو وہ خیر ہے اور جس کام سے انسانی ذات پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ شر ہے۔ چونکہ موجودہ دور کے مفکرین کے سامنے انسانی ذات کا تصور نہیں ہے۔ اس لئے ان کے پاس خیر و شر کا کوئی معیار نہیں ہے۔

جو عقلِ انسانی خیر و شر کے مسئلہ کو حل نہیں کر سکتی وہ اپنے لئے ضابطۂ حیات کیا بنا سکتی ہے۔ موقر اخبار ''ڈیلی ڈان'' کی اشاعت بابت 26 جون 2016ء میں ایک علمی مضمون طبع ہوا جس کا عنوان ''Democracy's woes'' ہے۔ یہ مضمون مشہور کالم نویس جناب محترم انجم الطاف صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ اس مضمون کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ مضمون

نگار نے جمہوریت کے نقائص تحریر کئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہٹلر بھی جمہوریت کے ذریعہ ہی اقتدار میں آیا تھا۔ مضمون نگار نے جو نقائص تحریر کئے ہیں وہ ان کی ذاتی سوچ کا نتیجہ ہیں۔ ہم جو نقائص عرض کریں گے، وہ قرآنِ کریم کا تبصرہ ہے۔ قرآنِ کریم انسان کو قانون وضع کرنے کا اختیار ہی نہیں دیتا۔ انسان جب بھی، اور جہاں بھی قانون بنائے گا، اس کے سامنے نوعِ انسانی کا مفاد نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنے قبیلے، اپنی قوم کا فائدہ سامنے رکھتا ہے۔ انگلستان، امریکہ، اور اس دور کے تمام مہذب شمار کردہ ممالک وہ ہیں جنہوں نے جب بھی قانون بنائے وہ صرف ان کے اپنے فائدے کے لئے تھے اور کمزور قوموں کے لئے نقصان رساں تھے۔ ساری انسانیت کی فکر کا نچوڑ UNO بھی ہر ناجائز کام کو جائز قرار دینے کا ادارہ ہے۔ ہمارے اپنے ملک کے حالات ہر شخص کے سامنے ہیں۔ یہ تحریکِ طلوع اسلام، عملی سیاست پر گفتگو کرنے سے اجتناب کرتی ہے اس لئے ہمارے لئے تبصرہ کرنے کا دائرہ بہت محدود ہے۔ ہمارے ملک میں ایک قانونی معاہدہ NRO کے نام سے وضع کیا گیا تھا کسی مہذب ملک کے شرفاء اس قسم کا قانون وضع کرنے کا خیال نہیں کر سکتے کیونکہ اس میں ملک کے تمام لٹیروں کی دولت کو جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ آج کل پانامہ لیکس کا چرچا ہر طرف ہے جس کے بارے میں آخری بات یہ ٹھہری ہے کہ Off-Shore کمپنیاں بنانا تو غیر قانونی ہی نہیں ہے صرف یہ دیکھ لیا جائے کہ اس کا سرمایہ جائز طریقہ سے حاصل کردہ ہے یا نہیں۔ اگر سرمایہ جائز طریقہ سے حاصل کیا گیا ہے تو پھر کوئی عیب نہیں اور لُطف کی بات یہ ہے کہ اس طریقہ کے جائز یا ناجائز کا فیصلہ بھی یہ لوگ کریں گے جو خود لیٹرے ہیں۔ یہ خود ایک دوسرے کو لیٹرا کہہ رہے ہیں۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ طریقہ کیا تھا۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اگر وہ روپیہ اس حال میں ملک سے باہر گیا ہے جبکہ دوسرے لوگ روٹی کو ترس رہے ہیں تو پھر سرمایہ لے جانے کے تمام طریقے ناجائز ہیں۔ سیاست یہ بھی ہے کہ بھارت کے وزیراعظم مودی نے گجرات میں مسلمانوں کا قتلِ عام کیا۔ کئی ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ احسان جعفری ممبر اسمبلی تھے۔ ان کے ہاں غریب مسلمانوں نے پناہ لی تھی لیکن ان کے ہاں بھی 69 مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا بین الاقوامی طور پر مودی کو ''Butcher of Gujarat'' کہا گیا۔ امریکہ نے ان کو ویزا دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن اب وہی مودی صاحب، امریکہ میں اسمبلی سے خطاب کر کے آئے ہیں۔ جمہوریت کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں مستقل اقدار کا تصور ہی نہیں ہے۔ ہر ملک کوئی بھی قانون بنا سکتا ہے ان ممالک نے Homosexuality، ہم جنس پرستی کو جائز قرار دیا۔ ان ممالک میں Incest کا رواج ہے۔ جس کی شناعت کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ جمہوری نظام کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ سرمایہ داری اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ ایک سرمایہ دار ہی اس نظام میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ آپ تمام جمہوری ممالک کی تاریخ دیکھ لیں، کسی ایک ملک میں بھی کوئی مزدور، مالی، چوکیدار، Cook، مستری اسمبلی کا ممبر نہیں بنا۔ اس نظام کی بنیاد ہی سرمایہ داری پر استوار ہوتی ہے غریب آدمی الیکشن لڑ ہی نہیں سکتا۔

اس نظام کی تیسری خامی یہ ہے کہ اس میں پارٹی بازی ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو حرام قرار دیا ہے۔ فرقہ بندی شرک ہے۔ قرآنِ کریم میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں۔ جس قدر مذہبی فرقہ بندی نقصان دہ ہے اسی طرح سیاسی

پارٹیاں بنانا نقصان دہ ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے کہ پارٹی کا سربراہ کتنا ہی بڑا جرم کرے، ساری پارٹی اس کے پیچھے کھڑی ہوجاتی ہے۔ آج کل ہمارے ہاں یہی ہورہا ہے۔ پارٹیوں کے ایک ایک ممبر کو اپنی پارٹی کے سربراہ کا جرم معلوم ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنی پارٹی کی ہی حمایت کرتے ہیں۔

اس نظام کی چوتھی خامی یہ ہے کہ اس میں حق و باطل کا کوئی معیار نہیں ہے۔ جو بات اکثریت کردیتی ہے وہ درست ہوتی ہے۔ لیکن اکثریت کا حق پر ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ اکثریت ایک ہی مسئلہ پر اقلیت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ چند ممبروں کی Floor-Crossing سے حق و باطل کا معیار بدل جاتا ہے۔

آج کل انگلستان میں یورپین یونین میں Remain اور Leave کا مسئلہ چل رہا ہے۔ ان کی پارلیمنٹ اور کیبنٹ کی اکثریت Remain کے حق میں ہے۔ ان کے ہاں اس مسئلہ پر ریفرنڈم ہوا جس نے Leave کا فیصلہ دیا۔ اسمبلی اور کیبنٹ بھی عوام کی نمائندہ ہے اور ریفرنڈم نے بھی عوام کی نمائندگی کی ہے۔

قرآنِ کریم انسانی مسائل حل کرنے کے لیے اپنا ایک نظام دیتا ہے جس کی وضاحت ہم آئندہ چل کے اس مضمون میں کریں گے کہ وہ نظام کس طرح انسانیت کے مسائل حل کرتا ہے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اسلامی نظام سے خوفزدہ ہے اور جب اس طبقہ کے سامنے اسلامی نظام کا قیام کا ذکر آتا ہے تو ان کا ذہن طالبان، داعش اور تھیوکریسی کی طرف چلا جاتا ہے۔ چونکہ قرآنِ کریم کا نظام، خلافت راشدہ کے بعد منقرض ہوگیا تھا، اور اس کے بعد وہ نظام کبھی قائم نہیں ہوا، اس لئے غیر مسلم حضرات اور ہمارے دانشور تھیوکریسی اور اسلامی نظام کو غلط ملط کردیتے ہیں۔ جبکہ تھیوکریسی اور اسلامی نظام میں کوئی چیز قدر مشترک نہیں ہے۔ ہم اس مضمون میں دونوں نظاموں سے بحث کریں گے اور ان کے امتیازات آپ کے سامنے لائیں گے۔

قرآنِ کریم کی رُو سے اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کرتا۔ کیونکہ اپنے اختیارات کسی کو تفویض کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جب تک وہ اختیارات مفوض سے واپس نہ لے لئے جائیں۔ وہ اختیارات تفویض کنندہ کے پاس نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق اس قسم کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن عیسائیت میں Popes کا ہی دعویٰ تھا۔ وہ کہتے کہ خدا نے اپنے اختیارات انہیں تفویض (Delegate) کردیئے ہیں۔ لہٰذا ان کا حکم خدا کا حکم ہوتا ہے اور وہ خدائی اختیارات کے مطابق انسانوں پر حکومت کرنے کا حق رکھتے ہیں اسی کا نام (Divine Right) تھا اور اسی طرح کی حکومت کا نام تھیوکریسی ہے عیسائیوں کا یہ تصور مسلمانوں میں آیا اور ''السلطان ظل اللہ فی الارض''، بادشاہ زمین پر اللہ کا سایہ ہوتا ہے۔ کا عقیدہ عام ہوگیا۔ پاکستان میں تو ملوکیت نہیں ہے یہاں ہمارے علماء کرام نے اسلامی نظام کا نعرہ بلند کیا، اور خود ہی اس کے علمبردار اور اجارہ دار بن گئے۔

ہمارے علمائے کرام نے پاکستان کے قیام کی آخر تک شدید مخالفت کی تھی۔ آپ اس نکتہ پر غور فرمائیں کہ ہندوستان کے علماء کے سامنے وہی قرآن ہے، وہی تفاسیر، وہی کتبِ احادیث، صحاح، ستہ، وہ ہی فقہ، وہی درس نظامی، یہی سب چیزیں ہمارے پاکستانی علماء کرام کے پاس ہیں۔ ہمارے بزرگ عمر کے علماء دیوبند سے ہی پڑھ کر نکلے ہیں اور یہاں آکر انہوں

نے مدارس قائم کئے اور اسی فکر کو آگے بڑھایا۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ بھارت کے علماء کرام پہلے بھی سیکولرازم کے حامی تھے اور آج بھی وہ سیکولرازم کے قائل ہیں۔ جبکہ پاکستان کے علماء شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی صدر آل انڈیا جمعیۃ العلماء ہند، اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب دونوں ہم عصر تھے۔ دونوں بیک وقت دارالعلوم، دیوبند میں درس وتدریس کے شعبے میں کام کرتے تھے۔ ان دونوں کے ہزاروں ہزار تلامذہ برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن تعجب یہ ہوتا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم تو سیکولرازم کے قائل تھے اور مولانا عثمانی، جو سرحد عبور کر کے، پاکستان تشریف لے آئے تھے انہوں نے پاکستان میں آتے ہی اسلامی نظام کا مطالبہ کر دیا۔ مولانا مفتی محمود مرحوم نے ایک بیان دیا تھا جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ وہ پاکستان بنانے کے جرم میں شامل نہیں تھے۔ پاکستان کی مخالفت کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیکولرازم کے قائل تھے لیکن ان کے نامور صاحبزادے مولانا فضل الرحمٰن صاحب شریعت کے نفاذ کے حامی ہیں۔

قرآنِ کریم نے انسانی تخلیق کے سلسلہ میں ابتدائی مراحل تو وہی بیان فرمائے ہیں جو حیوانات کی تخلیق میں زندگی گذارتی ہے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے انسان کو دیگر حیوانات سے ممتاز کر دیا اور اس امتیاز کے متعلق فرمایا وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (32:9) اس میں اللہ نے اپنی روح ڈال دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ (32:9)، انسان کو سماعت وبصارت اور قلب عطا کر دیا۔ اس آیت میں قرآنِ کریم نے خود روح کو Define کر دیا ہے کہ اس سے مراد ایک توانائی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں اور جس سے یہ انسانی تصورِ حیات وابستہ ہیں۔ قرآنِ کریم نے روحِ خداوندی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن روحِ انسانی کا ذکر قرآنِ کریم میں ایک مقام پر بھی نہیں ہے۔ یہ ایک توانائی ہے جب تک یہ اللہ کی ذات کی طرف منسوب رہی قرآنِ کریم اس کو روح کے لفظ سے پکارتا ہے۔ لیکن جب یہ توانائی انسان کی طرف منسوب ہوئی تو قرآن نے اس کے لئے نفس کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نفس کے لفظ سے روح اور روحانیت کی تردید ہو جاتی ہے۔ قرآں میں روحانیت کا لفظ نہیں آیا۔ روحانیت ایک موہوم اور فرضی تصور ہے جس کا کوئی واضح مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں ہے۔ اب جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ''جسم اور نفس'' کا مرکب ہوتا ہے۔ ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس نفس کی پرورش اور نشوونما کرے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ ہم اس نفس کے بارے میں آگے چند باتیں عرض کریں گے۔

ہمارے علماء کرام نے اس لطیف نکتہ کو Miss کر دیا کہ جب وہ توانائی انسان کی طرف منسوب ہوتی ہے تو قرآن اس کو نفس کہتا ہے اور یہ حضرات روح اور روحانیت کے چکر میں پھنسے رہے۔ قرآنِ کریم جب روحِ انسانی کا قائل ہی نہیں ہے اور نہ ہی اس نے اس کے تزکیہ کے کوئی اصول دیئے ہیں۔ ہمارے علماء چونکہ روح اور روحانیت کے قائل ہیں اور انہوں نے روحانیت کی ترقی کو انسانی زندگی کا مقصد بنایا ہے اور اس کی ترقی کے جو اصول مقرر کئے ہیں وہ قوم کے زوال کے سبب ہوتے ہیں۔ ہمارے علماء کرام نے روح کو مادہ کے مقابل میں رکھا ہے اور دونوں کو ایک دوسرے کی ضد قرار دیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو قوم یا فرد روحانی ترقی حاصل کریں گے وہ مادہ سے نفرت کریں گے۔ وہ دنیا سے بھاگیں گے اور دنیا کو بالکل ترک کر دیں گے۔ ہمارے علماء روحانی ترقی

کے لیے پرستش کو ضروری قرار دیتے ہیں اور وہ یہ پرستش جنگلوں، پہاڑوں، کونوں، کھدروں زاویوں میں کرتے ہیں وہ ترکِ دنیا، ترک علائق کے قائل ہیں۔ ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولی، ترکِ ترک۔ ان کا بہت پسندیدہ نعرہ ہوتا ہے۔ یہ رہبانیت کے قائل ہوتے ہیں جس کے متعلق قرآن نے فرمایا تھا :وَرَهْبَانِيَّةَ ٱبْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَٰهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ٱبْتِغَآءَ (57:27) ترجمہ: رہبانیت کا مسلک ہم نے ان پر واجب نہیں کیا تھا انہوں نے خود ہی اس کو ایجاد کیا اور ایجاد تو کر لیا لیکن اس کو نباہ بھی نہیں سکے۔

تھیوکریسی کے داعی ہمارے علماء کرام انسانی جسم بلکہ پوری مادی دنیا کو روحانی ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ خیال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب تک اسے راستہ سے نہ ہٹا دیا جائے روحانی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان کے لیے روحانی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیا کو تیاگ دے۔

یہ توانائی جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی ہے اور اس کی وجہ سے انسان حیوانات سے ممیز ہوتا ہے اور جس کو ہمارے علماء غلطی سے روح کہتے ہیں قرآن نے اس کو نفس، انسانی ذات یا خودی سے تعبیر کیا ہے۔ اس توانائی سے انسان صاحب اختیار و ارادہ ہوتا ہے اور اپنے اعمال کا ذمہ دار بنتا ہے۔ قرآنِ کریم کی مستقل اقدار پر عمل کرنے سے اس انسانی ذات میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ مستقل اقدار کے خلاف عمل کرنے سے اس ذات میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کرنا، انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ جب انسان مرتا ہے تو اس کا جسم مرتا ہے، اس کی ذات زندہ رہتی ہے اور اگر یہ مستحکم ہو گئی ہو تو مرنے کے بعد کی ارتقائی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔

کسی بھی نظام کو اختیار کرنے سے پیشتر اس نظام کے بنیادی تصورات پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔ جب تک آپ اس نظام کے بنیادی تصورات پر ایمان نہیں لاتے، آپ وہ نظام قائم نہیں کر سکتے۔ حضور ﷺ نے جب یہ اسلامی نظام قائم فرمایا تھا، تو جن لوگوں نے حضور ﷺ کا ساتھ دیا تھا وہ ان بنیادی تصورات پر پہلے ایمان لائے تھے۔ اس دور میں اسلامی نظام قائم کرنے میں دقت یہ ہے کہ ہم پیدائشی مسلمان ہیں۔ ہم مردم شماری کے رجسٹر کے مسلمان ہیں۔ جن بنیادی تصورات پر اسلامی نظام قائم ہوتا ہے ہم ان تصورات میں سے ایک تصور پر بھی ایمان نہیں لاتے۔ ہمیں ان تصورات کا علم ہی نہیں ہے۔ روحانیت کا عقیدہ اقامتِ دین میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن جو جماعتیں اس وقت اقامتِ دین کی داعی ہیں۔ وہ سب روح اور روحانیت کی قائل ہیں۔ روحانیت کے قائلین اقامتِ دین نہیں کر سکتے۔

اسلامی نظام کے بنیادی تصورات کو ہم بیان کرتے ہیں اسلامی نظام کی اساس انسانی ذات کے عقیدہ پر استوار ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص انسانی ذات پر ایمان نہیں لاتا، وہ حیوانیت کی سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔ اسے نہ تو مستقل اقدار کی ضرورت ہے اور نہ اسلامی نظام کی صفاتِ خداوندی کو اپنے میں منعکس کرنے سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے انسانی ذات میں صفاتِ خداوندی بشری حد تک موجود ہوتی ہیں، ان کو بالفعل کرنے سے اس کا ارتقاء ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی ذات کی نشوونما کے طریقے بیان کئے ہیں ان میں ہر طریقہ نظام کو بہتر سے بہتر بناتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُۥ يَتَزَكَّىٰ (92:18) جو اپنا مال دوسروں پر صرف کرتا ہے، اس کے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے فرمایا وَمَن تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِۦ (35:18) جو دوسروں کی

پرورش کرتا ہے اس سے اس کی اپنی پرورش ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں اس موضوع پر بے شمار آیات موجود ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جو شخص دوسروں کی پرورش کرتا ہے، اس سے اس کی اپنی پرورش ہوتی ہے۔ اسلامی نظام میں ہر شخص محنت کر کے اپنی آمدنی کو دوسروں پر اس لئے خرچ کرتا ہے کہ اس عمل سے اس شخص کی اپنی ذات مستحکم ہوتی ہے۔

اسلامی نظام میں ہر شخص وہ کام کرے گا جس سے اس کے اپنے نفس پر اچھے اثرات مرتب ہوں۔ اس نظام کے باشندے چوری اس لئے نہیں کرتے چونکہ چوری کرنے سے اس کے نفس پر بُرے اثرات مرتب ہوں گے۔ اگرچہ وہ شہری چوری سے اس لئے اجتناب کر رہا ہے تاکہ اس کے نفس کو نقصان نہ پہنچے لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس معاشرہ میں چوری کی کوئی واردات نہیں ہوگی۔ اسلامی نظام میں لوگ اس لئے جرم نہیں کرتے تاکہ ان کے نفس کی نشوونما جاری رہے۔ لیکن نفس کی نشوونما کے نتیجے میں اس معاشرہ میں بھی کوئی جرم باقی نہیں رہتا۔ جرائم کو روکنے کا واحد ذریعہ انسانی ذات پر ایمان لانا ہے۔ اگر کوئی معاشرہ انسانی ذات پر یقین نہیں کرتا، تو وہ انسانی معاشرہ نہیں ہے۔ وہ حیوانیت کی سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔

اسلامی نظام کے قیام کے لیے دوسرا مرکزی و بنیادی نظریہ مستقل اقدار کا تصور ہے۔ قرآنِ کریم نے بہترین معاشرہ کی تشکیل کے لیے جو اصول دیئے ہیں وہ مستقل اقدار کہلاتے ہیں۔ انسانی ذات کی نشوونما کا سارا دارومدار ان اقدار پر عمل کرنا ہے۔ یہ اقدار انسانی ذات کی بنیادی خصوصیات میں، صفات خداوندی اور مستقل اقدار ایک ہی چیز ہیں۔ جب کبھی ایک انسان کے سامنے مستقل اقدار اور اپنے ذاتی مفاد میں Tie آ پڑتی ہے تو مستقل اقدار پر عمل کرنے، اور ذاتی مفاد کو نظر انداز کرنے سے، انسانی ذات میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر عرض ہے کہ اگر مجھے اپنے بیٹے کو کالج میں داخل کرانا ہے لیکن میرے پاس کوئی رقم نہیں ہے اور میں اس بارے میں مجبور ہوں۔ لیکن اسی وقت کوئی سائل آجاتا ہے اور وہ مجھے کسی کام کرنے پر کچھ رقم Offer کرتا جس سے میں اپنے بیٹے کو کالج میں داخل کرا سکتا ہوں۔ اب میرے سامنے ایک Tie آ پڑتی ہے۔ اگر اس شخص سے رقم لے کر بیٹے کو داخل کرا دوں، تو میں اپنے مفاد کو اہمیت دوں گا۔ مستقل قدر کے خلاف کام کروں گا تو میرا نفس اس سے کمزور ہوگا۔ لیکن اگر میں مستقل قدر پر عمل کرتا ہوں، بچے کو کالج میں داخل نہیں کراتا اس سے میرے نفس پر اچھا اثر ہوگا۔ اپنے ذاتی مفاد کو چھوڑ کر مستقل اقدار پر عمل کرنے سے انسانی ذات میں استحکام ہوتا ہے۔

اسلامی نظام کے لئے تیسرا تصور مکافاتِ عمل کا عقیدہ ہے۔ جو انسان کو بُرے کام کرنے سے روکتا ہے اور جس کی وجہ سے اسلامی نظام مضبوط ہوتا ہے، انسان صاحب اختیار و ارادہ ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق بھی زندگی بسر کر سکتا ہے اور قوانین خداوندی کی نافرمانی بھی کر سکتا ہے۔ جب کوئی انسان قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے، تو اس کے تعمیری نتائج برآمد ہوتے ہیں اور اس سے اس شخص کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے لیکن جب وہ شخص قوانین خداوندی کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے تخریبی نتائج برآمد ہوتے ہیں، اور اس کی ذات پستی کی طرف چلی جاتی ہے۔ مکافاتِ عمل کی رُو سے غلط کاموں کے بُرے نتائج سامنے آجاتے ہیں اس لئے لوگ بُرے کاموں سے اجتناب کرتے اور معاشرہ ان کے بُرے

اعمال کے بُرے نتائج سے محفوظ رہتا ہے۔

اسلامی نظام کے لیے چوتھا عقیدہ صفاتِ خداوندی کا ہے ہر شخص اپنے میں صفاتِ خداوندی زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رب ہے۔ اس لیے ہر شخص کو دوسروں کی ربوبیت کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ رزاق ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کے لئے رزق کا سامان فراہم کرے۔ اللہ تعالیٰ کریم ہے رحیم ہے، ستار وغفار، عزیز ورؤف ہے ہر شخص کو اِن صفات کو اپنے میں پیدا کرنا چاہئے۔ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں پیدا کرنے سے انسان کی بہترین سیرت سامنے آتی ہے اور جو شخص ان صفات کا حامل ہوگا، اس کی بہترین سیرت ہوگی۔

جس طرح ایک انسان صفاتِ خداوندی کا حامل ہوتا ہے۔ اسی طرح اُمت مسلمہ بھی بطورِ مجموعی ان صفات کی عکاس ہونی چاہئے۔ اُمتِ مسلمہ کو ساری انسانیت کی ربوبیت کرنی چاہیے۔ اُمتِ مسلمہ عزیز، یعنی صاحب غلبہ ہونی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت السلام اور المومن ہے۔ ساری اُمت مسلمہ، کو پوری انسانیت کے لئے سلامتی اور امن فراہم کرنا چاہیے۔ اسی طرح اسلامی مملکت بھی صفاتِ خداوندی کی حامل ہوتی ہے اور ان صفات کی مظہر ہوتی ہے۔ ہم بطورِ عقیدہ اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان صفات کا حامل ہے۔ وہ رحیم وکریم ورب وغفور ہے۔ لیکن ہم اس بات کو بطور عقیدہ تسلیم کرتے ہیں۔ جب آپ اسلامی نظام قائم کر کے، ان صفاتِ خداوندی کو ٹھوس شکل میں جاری کریں گے تو ذاتِ خداوندی تمام صفات کے ساتھ اس دنیا میں جلوہ گر ہوجاتی ہے۔ اور صفاتِ باری تعالیٰ پر جو نظری اعتقاد ہے وعلی وجہ البصیرت سامنے آجاتا ہے۔

اسلامی نظام کے شہریوں میں صفاتِ خداوندی کو نمودار کرنے کا ایک داعیہ موجود ہوتا ہے، عدل کرنا، ہر شہری کی ذات کا ایک داعیہ ہے جب اسلامی نظام صفاتِ خداوندی میں سے ایک صفت، مثلاً عدل پر عمل کرتی ہے، اور اس کا شہری اس عدل کی اطاعت کرتا ہے تو اس کی یہ اطاعت کسی خارجی حکم کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ اس کی اس اطاعت سے، اس کی ذات کے ایک تقاضا کی تسکین ہوتی ہے۔ جس طرح پانی پینے سے خود انسان کی پیاس بجھتی ہے اور تسکین ہوتی ہے یہ کسی خارجی حکم کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اسلامی مملکت کی اطاعت سے کسی خارجی حکم کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اس سے انسان کے اپنے تقاضوں کی تسکین اور آسودگی ہوتی ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2:286) اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی اطاعت سے خود انسان کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔

یہ بات بھی بڑی اہم ہے اور ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اسلامی مملکت خود مقصود بالذات نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ دو مقاصد عالیہ کے حصول کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ پہلا مقصد تو یہ ہے کہ اس مملکت میں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ جو غیر اسلامی مملکت میں نہیں ہوسکتی۔ سیکولر حکومتوں کے سامنے انسانی ذات کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ وہ مملکتیں انسانیت کے معیار تک پہنچتی ہی نہیں۔ وہ تو صرف حیوانیت کے معیار پر ہوتی ہیں۔

اِس مملکت کے مقام کا دوسرا مقصد مقاصدِ خداوندی اور مواعیدِ الٰہی کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس مملکت کے ہر شہری کو رزق فراہم کرے گا۔ اگر کوئی مملکت اپنے شہریوں کو رزق مہیا نہیں کرتی تو وہ اسلامی نہیں ہے۔

حضور ﷺ کا حکم ہے کہ اگر کسی بستی میں ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو جائے، تو اس پوری بستی سے اس مملکت کی اطاعت مرفوع ہو جاتی ہے۔ اسلامی مملکت اللہ تعالیٰ کے تمام وعدوں کو پورا کرتی ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ مسلمان غالب رہیں گے، مسلمان تو کبھی مغلوب ہو ہی نہیں سکتا (4:141) اسلامی مملکت سب سے زیادہ مضبوط مملکت ہوتی ہے۔ اگر کوئی اسلامی مملکت اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے نہیں کرتی تو وہ عنداللہ جواب دہ ہوتی ہے۔ اسلامی مملکت میں طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں ہوتے اسلامی قوانین ہوتے ہیں۔ طاقت کا سرچشمہ قرآن ہوتا ہے اور اسلامی مملکت اللہ کو ہی جواب دہ ہوتی ہے۔ اگر وہ اللہ کے وعدے پورے نہیں کرتی تو وہ عنداللہ جواب دہ ہے۔ اللہ کے ہاں ہی اس کی پکڑ ہوگی اور اس کی پکڑ بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (85:12) ترجمہ: بیشک تیری رب کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے یہ بات واضح رہے کہ جو جماعت بھی اقامتِ دین کے لئے اٹھتی ہے اس کا فرض ہے کہ وہ روحانیت اور پرستش کے عقیدہ کو اپنے ذہن سے بالکل نکال دے۔ یہ سب بڑے بڑے اولیاء کرام یہ جبہ و دستار، یہ روحانی دنیا، یہ سب قرآن کے خلاف ہیں یہ بڑے بڑے خانوادے یہ سلاسل تصوّف، یہ زاویہ ہائے طریقت، سب مسلمانوں کے زوال کا سبب ہیں ہمارے دانشور چونکہ مغربی فکر سے متاثر ہیں اس لئے وہ مغرب کے تتبع میں یہ بات کہتے ہیں کہ چرچ کا دائرہ محدود ہونا چاہئے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ قرآن کے نزدیک چرچ کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ قرآن کے نزدیک تو صرف سٹیٹ ہوتی ہے سٹیٹ کی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ جب سٹیٹ کے ذریعے ہی عبادتِ خداوندی ہو جاتی ہے تو پھر چرچ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

قرآن کریم نے فرمایا اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۠ (5:8) ترجمہ: عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں عدل کا وہ طریقہ تھا جو خود خدا کا تجویز کر دیا تھا تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ (5:106) ترجمہ: اُنہیں نماز کے بعد روک لو اور وہ اللہ کی قسم کھا کے کہیں ہم نے اپنی قسم کسی معاوضہ کے بدلے فروخت نہیں کی۔ ہمارا قریبی عزیز کیوں نہ ہو ہم اللہ کے لیے سچی گواہی کبھی نہیں چھپائیں گے اگر ایسا کریں تو ہم گنہگاروں میں سے ہوں گے۔ آپ غور فرمائیں کہ قرآن کا تجویز کردہ طریقہ عدل کرنے کا کس قدر سادہ ہے۔ مسجد میں ہی بیٹھ گئے اور سارا دارومدار قسم پر رکھا۔ آج عدل کا طریقہ بہت Sophisticated ہے۔ اس میں انگھوٹھوں کے نشان، DNA، Forensic Evidence، Audio، Video، کیمرے یہ سب عدل کے طریقے میں شامل ہیں۔

جس طرح قرآن نے عدل کا حکم دیا ہے اسی طرح اقیموا الصلوٰۃ، صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ایسا نظام قائم کرنا جس میں قوانینِ خداوندی کی مسلسل اطاعت ہوتی ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے اس کو رواں دواں رکھنے اس نظام کو مستحکم کرنے کے لیے جو ادارے ہوں گے وہ سب مساجد اللہ ہیں یہ ادارے اس نظام کو قائم رکھتے ہیں۔ ان اداروں کے چلانے میں روحانیت کو کوئی دخل نہیں، اور نہ ہی اس میں پرستش کو کوئی دخل ہے مقصد صرف اللہ کا نظام قائم کرنا ہے اور یہ سب ادارے اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہیں (10:87) اس نظام کا مقصد انسانی ذات کا ارتقاء اور اللہ کے وعدوں کو عملاً پورا کرنا ہے۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ (40:44) میں تم سے جو کچھ کہہ رہا ہوں تم جلدی اس کو یاد کرو گے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد
dr.inam57@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط دوم)

قرآنی تعلیمات کے مطابق مرد عورت سے افضل اور نہ ہی عورت مرد سے کمتر ہے

قرآن کریم والدین سے نیک سلوک کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

8۔ فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا (23۔17:24)

''والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، اور ان سے سخت کلامی نہ کرو۔ انہیں جھڑکو نہیں بلکہ ان سے ادب اور عزت کے ساتھ بات چیت کرو اور نہایت ہمدردی سے انہیں اپنے دامنِ پرورش کے نیچے رکھو۔ اور اللہ سے دعا کرو کہ جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا پوسا تھا، تو ان کی پرورش کا سامان بہم پہنچاتا رہ۔''

جس طرح ماں باپ سے حُسنِ سلوک کی تاکید ہے، اسی طرح رشتہ داروں سے بھی نیک سلوک کا حکم ہے۔

9۔ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ط (33:6،8:75)

''اور رشتہ والے اللہ کے قانون کے مطابق ایک دوسرے سے زیادہ نزدیک ہیں۔''

10۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى (4:35،2:83)

''اور والدین کے ساتھ بھلائی کرو اور رشتہ داری کے تعلقات کا لحاظ رکھو۔''

مُختصر طور پر یہ امر ملحوظِ نگاہ رہنا چاہیئے کہ اِس جنتی معاشرہ کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اس میں نہ کسی کو کوئی خوف ہوتا ہے نہ حُزن بلکہ ہر طرف سے سلامتی ہی کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ہر فرد کی ذات انسانیت کے بہبود میں زیادہ سے زیادہ contribute کرتے ہوئے معاشرے میں عزت و اکرام کے ساتھ ممتاز مقام حاصل کرتی جاتی ہے۔ اُن سبھی کی زندگی حُریت اور استغناء کی کیفیت لئے ہوئے نفسِ مطمئنہ کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

نکاح اور خصوصی طور پر اِس کے قرآنی تصور کے متعلق ہمارے بچوں کو زیادہ آگاہی نہیں ہوتی یا پھر جو آگاہی دی جاتی ہے، اُن میں اختلافات پائے جاتے ہیں جن سے تسلی نہیں ہو پاتی۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے عورت کے مقام کو پیدائش ہی سے نہایت ہی پست اور اضافی پوزیشن کا درجہ دیا جاتا ہے، جس میں بیوی کو اپنے شوہر کا ہر لحاظ سے محکوم اور تسکین پہنچانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اکثر لوگ یہ دلیل دیتے پائے جاتے ہیں کہ:

1۔خواتین کی ذہنی استعداد مردوں کے مقابلے میں پسماندہ ہے۔

2۔وہ حساب کتاب میں کمزور ہیں۔

3۔ریشنل نقطہ نظر نہیں رکھتیں۔

4۔ان میں قائدانہ صلاحتیں نہیں۔

5۔یہ جذباتی مخلوق ہے۔

6۔یہ اعصابی طور پر بھی بہت کمزور ہے وغیرہ وغیرہ۔

اِس قسم کے دلائل دیتے وقت ہم بُھول جاتے ہیں کہ جس فرد کو سازگار ماحول میسر نہ ہوا سکی مخفی صلاحتیں کیسے نمو پا سکتی ہیں؟

عورتوں کی اصل آزادی اور برابری یہ ہے کہ دنیا کے تمام مالی و مادی شعبوں میں عورتوں کا برابر کا حصہ ہو۔۔دنیا کے تمام وسائل پر انہیں مکمل دسترس حاصل ہو۔۔مگر ایسا نہیں ہے۔۔دنیا کے تقریباً تمام وسائل مردوں کے قبضے میں ہیں۔۔۔دنیا میں ہمیشہ وسائل سے محروم اور کمزور طبقات کا استحصال ہوتا ہے۔

اگر عورتیں واقعی برابری چاہتی ہیں۔۔اپنی زندگی پورے حق سے بتانا چاہتی ہیں۔۔انسانی معراج کے زینے طے کرنا چاہتی ہیں تو انہیں مظلومیت کے سب لبادے اتار کر عملی میدان میں خود کو مضبوط بنانا پڑے گا۔۔اپنی ذہنی صلاحتیں بروئے کار لانا ہوں گی۔

خواتین نہ کم عقل ہیں نہ کم فہم۔۔اُن کو بھٹکایا گیا ہے۔اُن کو دبانے کے لیے عورت کی مصنوعی کم فہمی اور جسمانی کمزوری کے حق میں دلائل گھڑے گئے ہیں۔۔اس مشینی دور میں جسمانی مشقت اب کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔لہذا اب وقت ہے کہ خواتین درست سمت میں سفر شروع کریں۔۔یہ دنیا عورت کی بھی اتنی ہی ہے جتنی مردوں کی ہے۔۔تمام زمینی وسائل پر عورت کا برابر کا حق ہے۔عورت کو خود آگے بڑھ کر یہ حق حاصل کرنا ہوگا۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ ہمارے ہاں عورت کے مقام کو پیدائش ہی سے نہایت ہی پست اور اضافی پوزیشن کا درجہ دیا جاتا ہے، جس میں بیوی کو اپنے شوہر کا ہر لحاظ سے محکوم اور تسکین پہنچانے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔بدقسمتی سے مُعترضین عورت کو مرد سے کمتر رکھنے کے اپنے دعاوی کے ثبوت میں جو دلائل پیش کرتے ہیں، وہ قرآنی آیات ہی سے بِالواسطہ یا بِلاواسطہ روایتی تفسیروں کی مدد سے اخذ کر کے سامنے لائے جاتے ہیں۔لہٰذا مَیں نے مناسب یہی سمجھا کہ اُن کی طرف سے پیش کردہ ہر دلیل کا رد خود اُن کی طرف سے پیش کردہ آیات کے حوالوں سے اخذ کئے ہوئے عورتوں کو کمتر حیثیت دینے کے تصورات کے جوابات علمی مستند ذرائع سے مرتب کئے گئے مفہوم کی روشنی میں تجزیہ کر کے سامنے لاؤں۔

اُن کے بہت سے دلائل سے مَیں نے درجِ ذیل تئیس (23) دلائل کو جواب کے قابل سمجھا ہے، جن کا ترتیب وار تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

پہلی دلیل:

نابالغ لڑکی سے نکاح کی اجازت کا موجود ہونا۔

اِس ضمن میں پہلی دلیل حکومت کے ادارہ اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے منظور کردہ قرارداد کی روشنی میں دی جاتی ہے کہ جس میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے بچیوں کی صغرسنی کی عمر میں باقاعدہ شادی اور صُحبت کرنے کے موقف کی تائید کرتے ہوئے باقاعدہ اس کی اجازت دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ اجازت کی نفی سے عمومی طور پر عورت کی پوزیشن کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اِس میں اُن کی مرضی کے بغیر ہی نکاح کی رسم ولی کی اجازت ہی سے انجام پذیر ہو جاتی ہے۔ اگر اُن کی سفارش اسلاف کی روش کی روشنی میں تسلیم بھی کر لی جاتی ہے تو وہ شائد یہ بُھول جاتے ہیں کہ یہی اصول بچوں پر بھی اُنہی شرائط کے ساتھ لاگو ہوتا ہے۔ اِس طرح دونوں مرد و زن کی حیثیت مساوی رہتی ہے۔ ایسی صورتِ حال البتہ نکاح کے معاہدہ کے موثر ہونے کی حیثیت کھو بیٹھتی ہے کیونکہ اِس میں بِلا جبر و اکراہ کے داخل ہونے کی لازمی شرط شامل نہیں ہوتی۔ لہذا اِس دعوٰی اور دلیل کا تجزیہ لیا جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

نکاح کے معاہدہ کے لئے عاقل و بالغ ہونا بطور لازمی شرط:

یہ حقیقت ہے کہ قرآن میں نکاح کے لئے بالغ ہونے یا نہ ہونے کا براہِ راست ذکر نہیں پایا جاتا۔ اِس کا البتہ اخذ کرنا مُشکل نہیں کہ مکتبِ مُلا کی دلیل کے رد میں قرآن کریم نے نکاح کی ترکیب ہی میں بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ (4:6) لفظ استعمال کیا ہے۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ (4:6)

اور (پرورش اور تربیت کے علاوہ)، ان یتامٰی کو جانچتے رہو (کہ ان کی صلاحیتیں کس حد تک نشوونما پا چکی ہیں)، یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم کو ان میں عقل کی پختگی نظر آئے، تو ان کا مال واپس کر دو۔

یہاں تو قرآن نے سن نکاح تک پہنچ جانے کی خاصیت ہی بلوغت، اور عقل کی پختگی بتائی ہے اور یہ بھی دیکھا جائے گا کہ یتیموں میں اپنے مال کو سنبھالنے کی اہلیت پیدا ہو گئی ہے یا نہیں۔

اِس بات کی مزید وضاحت بھی خود قرآن نے دوسرے مقام پر یوں کی ہے کہ

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ (17:34)

اور یتیم کے مال کے قریب تک بھی مت جاؤ، سوائے اس صورت کے، جو مال کے عمدہ انتظام کے لئے ضروری ہو، جب یتیم جوان ہو جائیں، اور (ان کی عقل و فکر میں پختگی آ جائے تو) ان کی امانت، ان کے حوالے کر دو۔

اشداً وہ کیفیت ہے، جسے ذہنی اور جسمانی جوانی کہتے ہیں۔ بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ (4:6) تو نکاح کی عمر ہے اور اشداً کے لفظ سے جوانی کی عمر ہونے کی تشریح بھی کر دی اور کہا کہ:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ (40:67)

''اُس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ (مٹی) سے کی (پھر مُختلف مراحل سے گزارتے ہوئے) اِسے نطفہ کے مقام پر لے آیا پھر جونک کی قسم کا لوتھڑا یعنی علقہ بنایا پھر تُم کو انسانی بچہ کی شکل میں دنیا میں لے آیا پھر تم جوانی کی عمر کو پہنچتے ہو، پھر بوڑھے ہو جاتے ہو۔''

گویا اشداً متعین ہو گیا یعنی بچپن کے بعد، مگر بڑھاپے کی عمر سے پہلے، یہ ہے جسے بلوغت کہا گیا ہے، اور یہ ہے جسے نکاح کی عمر کہا ہے۔ قرآن نے اشداً نکاح کی عمر بتائی ہے، اس لئے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اشداً سے پہلے یعنی بچپن میں نکاح نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا نہ تو نابالغ کے نکاح کے معاہدہ کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی لڑکے یا لڑکی کی طرف سے کسی دوسرے کی رضامندی کی شرط یا پابندی عائد کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود ان کی رضامندی بغیر خارجی جبر کو ہی کافی سمجھا جائے گا۔

دنیا کے سبھی قوانین نے اللہ کا یہ قانون دریافت کیا ہوا ہے کہ نابالغ کی رضامندی کے بغیر نکاح بمعنی معاہدہ ناقابلِ قبول رہے گا۔ اِس کے لئے عاقل و بالغ ہونا بنیادی شرط کے طور نافذ العمل ہے۔ نکاح بمعنی معاہدہ عاقل و بالغ کے درمیان نہ ہو تو اُسے کالعدم قرار دے دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے بالغ لڑکے اور لڑکی کا یہ معاہدہ کہ وہ ان تمام حقوق و فرائض کے ساتھ جو اس باب میں اللہ نے عائد کئے ہیں ازدواجی زندگی بسر کریں گے، نکاح کہلاتا ہے۔

لہٰذا ہمارے ہاں صغرسنی میں نکاح کی اجازت دینے کے لئے جو صحیح بخاری کی حدیث میں درجِ ذیل عمل رسولِ کریم کی طرف سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ قرآنی تعلیم کے منافی اور سیرتِ رسول سے مُتصادم ہونے کے بنا پر خود احادیث مرتب کرنے والے اصولیین کے نزدیک بھی ناقابلِ قبول ہونا چاہیئے۔ لہٰذا درجِ ذیل صحیح بخاری کی حدیث جو قولِ رسول کی طرف منسوب تو کی جاتی ہے، لیکن کسی صورت میں بھی قولِ رسول کے درجہ کے استحقاق رکھنے کے اہل ہونے سے محروم ہی رہے گی۔

صحیح بخاری میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

''خود حضرت عائشہؓ کی زبان میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے شادی کی تھی۔ میری والدہ میرے پاس آئیں اور مجھے ایک گھر میں داخل کر دیا۔ پھر مجھے کسی چیز نے خوفزدہ نہیں کیا سوائے رسول اللہ (کی آمد) کے۔ یہ چاشت کا وقت تھا''۔

(صحیح بخاری، تالیف محمد بن اسماعیل بخاری، ترجمہ مولانا ظہور الباری اعظمی، علم و عرفان پبلشرز سن ندارد، جلد سوم صفحہ 73)

اس روایت سے ایک صفحہ ہی قبل صفحہ نمبر 72 میں اسی کتاب میں درج دوسری روایت میں وضاحت ملتی ہے کہ

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے جب نکاح کیا تو ان کی عمر چھ سال تھی اور جب ان کے ساتھ خلوت کی تو ان کی عمر نو سال تھی اور وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نو سال تک رہیں''۔

قرآنی تعلیم اور سیرتِ رسول کے مطابق ہونے کی وجہ سے تاریخ کی وہ روایات زیادہ قرینِ قیاس ہیں، جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کو نکاح کے وقت بالغ اخذ کیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآنی تعلیم کے برعکس امام بخاری کی درجِ بالا

روایت کے تناظر میں حکومت کے ادارہ اسلامی تحقیقاتی کونسل نے ابھی حال ہی میں حکومت سے متفقہ طور پر صغر سنی میں نکاح کی اجازت دینے کی سفارش کی ہے۔

عُلمائے کرام کی مُتفقہ طور پر سفارش کی منظوری پر مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا کہ

برِصغیر کی تقسیم سے پہلے انگریز کے راج میں ایک شاردا ایکٹ کے نام سے بل پاس ہوا، جس میں نابالغ کے نکاح کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے قابلِ تعزیر جرم ہونے کی بنا پر سزا کا مستوجب قرار دے دیا گیا۔ اِس پر ہمارے سبھی ائمہ اور مُفتیانِ کرام اِسے مذہب اور مسلمانوں کے پرسنل لاز پر براہِ راست حملہ تصور کرتے ہوئے سیخ پا ہو گئے اور اِسی ضمن میں علامہ اسلم جیراجپوری نے شاردا ایکٹ کے خلاف ''جس میں نابالغ کی شادی کی ممانعت کا قانون منظور ہوا تھا'' تمام علماء کی اکٹھے ہو کر ایک متفقہ ریلی نکالنے پر ریمارکس دیئے کہ:

''ہماری مُسلم اُمہ کی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ ہمارے علمائے حق جب بھی کبھی متفق ہوئے ہیں۔ تو ہمیشہ باطل پر ہوئے ہیں''

دوسری دلیل، وراثت میں عورت کا آدھا حصہ رکھنا:

عورت کی حیثیت کو قرآن کی رو سے وراثت میں متعین مرد کے مقابل آدھا حصہ ملنے کی بنا پر کمتر درجہ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اِس دلیل کا قرآن ہی کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

میاں بیوی کے درمیان تقسیمِ کار کی رو سے وراثت کی تقسیم کی وضاحت:

قرآن میں ہے کہ:

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۠ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ (4:11)

نسبی رشتوں کے سلسلے میں) تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ کا حکم یہ ہے کہ لڑکے کے لئے دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے۔

وراثت میں بیٹے کا حصہ بیٹی سے دوگنا کیوں ہے؟:

اِس ضمن میں پہلے تو یہ بات یاد رکھی جائے کہ مرد کا فریضہ رکھا گیا ہے کہ وہ عورت کا کفیل ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34)

''تقسیم کار کی رو سے مردوں کو عورتوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا ذمہ دار بنایا گیا ہے۔''

دوسری بات یہ کہ عورت فطرت کی طرف سے متعین کردہ وظائف زندگی یعنی حمل، بچے کی تربیت، پرورش میں، اس کا بڑا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ضروریات زندگی بغیر کسی قسم کی پریشانیوں کے پوری ہوتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے مرد کو عورت کا سامان زیست مہیا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔

اس کے برعکس مرد سارا وقت کام کر سکتا ہے۔ زیادہ وقت میسر آنے کی وجہ سے عموماً مرد عورت کے مقابلے میں زیادہ کما

سکتا ہے، اس لئے مرد کو گھر کے اخراجات پورا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ یہ ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ باپ اپنی اولاد (لڑکوں اور لڑکیوں) کی پرورش کرتا ہے۔ شادی کے بعد بیوی کے سامان زیست کی ذمہ داری مرد پر ہوتی ہے۔ بیوہ ہونے کی صورت میں عورت کی پرورش عورت کے بیٹے کرتے ہیں۔ چونکہ اخراجات برداشت کرنے کی ذمہ داری مرد کی ہوتی ہے، اس لیے خدا نے مرد کو دو حصے دیئے اور عورت کو ایک حصہ دیا ہے۔

لیکن اگر حالات ایسے ہوں کہ عورت ذرائع پرورش کی زیادہ محتاج ہے، تو اس مقصد کے لئے خدا نے وصیت کا حکم بھی رکھ دیا ہے، جس کی رو سے ضرورت مند خاتون کو زیادہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ یہ اصول نہیں ہے کہ عورت کو مرد کے مقابل ہر حالت میں آدھا ہی حصہ ملے گا۔ اسی آیت میں کہا کہ ماں اور باپ دونوں میں سے ہر ایک کا حصہ یکساں یعنی (1:6) حصہ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایسی صورت میں مرد اور عورت برابر ہو جاتے ہیں۔

اگلی آیت میں کلٰل (کلالہ) شخص کی جائیداد میں سے بہن اور بھائی دونوں کو برابر حصہ (1:6) بتایا گیا ہے۔ یہ تو انتظامی صورت حال ہے، جس میں خدا دیکھتا ہے کہ ذمہ داری کے لحاظ سے کس کی کیا ذمہ داری ہے؟ عورت تو آدھا لے کر بھی مرد کو دے دیتی ہے کہ گھر کے اخراجات میں اسے کام میں لاؤ۔ یہ آدھا بھی اس مقصد کے لئے ہے، ورنہ یہ دلیل نہیں ہے کہ عورت کو قرآن کریم نے مرد کے مقابلے میں کچھ نیچا رکھا ہے۔ بہرحال تقسیم وراثت میں بیٹے کو بیٹی سے دوگنا دینے کی وجہ یہی ہے کہ کنبہ کے اخراجات کا کفیل مرد ہے، عورت نہیں ہے۔

بیوی کے گھر کی خصوصی ذمہ داری سے البتہ یہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ گھر سے باہر کام کرنے اور معاشی آسانی پیدا کرنے میں مدد و معاون ہونے سے روک دی گئی ہیں۔ عورتوں کو کمائی کرنے سے روک دینے کا نتیجہ اخذ کرنے اور اُسے اِس بنا پر کمتر قرار دینے کی البتہ قرآن تردید کرتا ہے اور اس ضمن میں ہدایت دیتا ہے کہ

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ (4:32)

جس طرح مرد کی کمائی میں اُس کا (پورا) حصہ ہے، اسی طرح عورت کی کمائی میں اُس کا (پورا) حصہ ہوتا ہے۔

اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ کمائی کرنے کی اور اُس پر ملکیت کے حق رکھنے کی قرآن میں دونوں مرد و زن کو اجازت دی گئی ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ نہ صرف کمائی کرنے بلکہ رزق بہم پہنچانے کا فریضہ بھی عورت نبھا رہی ہے۔ سورہ مریم میں قرآن نے رزق ہی کے معاملے میں عورت کے فرائض کی نشاندہی کر کے مردوں سے برتری نہیں تو یکسانیت کا درجہ رکھنے میں تو کسی کو بھی شک کرنے کی گنجائش کا سرے ہی سے خاتمہ کر دیا ہے۔

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ ۖ (31:14)

اور ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر بچے کو پیٹ میں رکھا (رحم مادر میں ہم نے ربوبیّت کی)، اور پھر دو سال بعد ماں نے اس کا دودھ چھڑایا (ماں نے ربوبیّت کی۔ اس ربوبیّت کے سبب) ہم نے انسان کو تاکید کی کہ میرے، اور اپنے والدین کے شکر

گزار رہیں (یعنی میرے قوانین کی نگہداشت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ)۔

بچّے کی پیدائش کے بعد ماں بھی بچے کی ربوبیّت میں شریک ہوجاتی ہے۔ اب بچّے کی پرورش کا ذریعہ خدا کے طبیعی قانون کے تحت جاری ہونے والا ماں کا دودھ ہے۔ رحم کے اندر یہ بات نہیں تھی کہ ماں نہ چاہے تو بچے کی پرورش نہ ہو سکے۔ پیدائش کے بعد سامان زیست اور دودھ تو خدا ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے، لیکن بچے کو بروقت، بقدر ضرورت دودھ دینا، اس کی حفاظت کرنا، اس کی دیکھ بھال کرنے میں ماں کا کردار بھی شامل ہوجاتا ہے۔

یوں انسان کی پرورش میں خدا اور ماں دونوں شریک ہو گئے۔ حیوان اور انسان کی طبیعی پرورش کا پہلا اور دوسرا مرحلہ یکساں ہوتا ہے، لیکن انسانی بچے کی پرورش میں زیادہ مشقتیں اٹھانا پڑتی ہیں اور وقت بھی زیادہ درکار ہوتا ہے۔ حیوانوں میں سے کوئی حیوان بھی ایسا نہیں ہے جس کے بچے کی پرورش کے لئے انسانی بچے کے برابر وقت درکار ہو۔ لہٰذا مرد کا عورت کو رزق پہنچانے کے فریضہ کی بنا پر عورت کو کمتر قرار دینے کی دلیل ہی بِلا جواز ہے، کیونکہ عورت تو بچے کی پیدائش سے قبل اور پیدائش کے زمانۂ آغاز ہی سے اُسے دودھ پلا کر زندہ رکھ رہی ہوتی ہے۔

تیسری دلیل، ایک مرد کی گواہی کو دو عورتوں کی گواہی کے برابر رکھنا:

وراثت میں آدھا حصہ متعین ہونے کی ملتی جُلتی حکمت کے نتیجہ میں عورت کی گواہی کو بھی قرآن سے مرد سے آدھی رکھنے کی دلیل پیش کر کے عورت کے درجہ کو یا رلوگ کمتر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اِسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ عورتوں سے امتیازی سلوک کے جواز کے حق میں ''اسلامی فقہ'' کے مطابق اعلان کر دیا گیا کہ عورت کے سامنے اگر اس کے خاوند کو قتل کر دیا جائے تو اس کی شہادت نہیں لی جاسکتی۔ روایات کی بنیاد پر فقہ کے قوانین بنے، اور پھر فقہ کو قیامت تک کے لئے غیر متبدّل ''شریعت حقہ'' قرار دے دیا گیا۔

فقہ کی رو سے فوجداری کیس میں:

1۔ عورت کی شہادت ہی نہیں لی جاسکتی۔

2۔ دیوانی مقدمے میں شہادت دو عورتوں کی ایک شہادت کے برابر ہوگی۔

3۔ رسول اللہؐ سے منسوب حدیث میں ہے کہ ''عورت کی دیت (خون بہا) آدھی ہے''۔

میرا چونکہ ڈاکٹریٹ کا موضوع فلسفہ اور قرآن رہا ہے، اس لئے فِقہ پر بات کرنے سے احتراز ہی کرتا ہوں۔ یہاں البتہ قرآن کے ماننے والوں کی یہ حالت زار ہے کہ دوسری اقوام تو اپنے ہاں سے عورتوں سے امتیازی سلوک ختم کر لیں گی، لیکن روایات (احادیث) کی موجودگی میں مسلمان اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہے ہیں۔ حیرانگی کی بات ہے کہ قرآن کے اِن کی اِس روش کے خلاف واضح اعلانات کے باوجود مکتبِ مُلا خوابِ خرگوش سے بیدار ہونے کا نام بھی نہیں لے رہا اور نہ ہی اُمت کو بیدار ہونے کا جواز مہیا ہونے دیتا ہے۔ لہٰذا اِس کا تفصیلی تجزیہ لینا ضروری ہو گیا ہے۔

عورت کی گواہی قرآن کی روشنی میں:

قرآن کے درجِ بالا وراثتی تناظر میں قرآن سے غلط طور پر منسوب کر کے ایک مرد کی گواہی کو دو عورتوں کی گواہی کے برابر درجہ دیا جاتا ہے۔ قرآن میں اِس کا ایک ہی آیت میں ذکر پایا جاتا ہے کہ

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ (2:282)

ایسے (مالی) معاملات کے وقت، اپنے میں سے، دو مَردوں کو بطور گواہ ٹھہرا لیا کرو۔ اگر کسی وقت دو مرد موجود نہ ہوں، تو (فریقین کی رضامندی سے) ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ بلا لو۔ یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں۔ دو عورتیں اس لیے کہ اگر ایک عورت کو کچھ مغالطہ لگ جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔

اِس آیت سے دوسری عورت کی صرف پہلی گواہ کو ضرورت پڑے تو دوسری کی گواہی نہیں بلکہ صِرف یاد دہانی کے فعل سے مُختص کرنے سے بھی مترشح ہوتا ہے کہ عورت کی گواہی آدھی نہیں، پوری ہے۔

اِس آیت میں لین دین کی بات کا ذکر ہو رہا ہے، جو زیادہ تر مردوں کے درمیان ہی طے پاتے ہیں۔ اِس تناظر میں قرآن نے کہا کہ گواہی کے لیے دو مرد نہ ملیں، ایک ہی ملے، تو دوسرے کی جگہ دو عورتیں لے لیا کرو۔ گواہی کے وقت ایک مرد کے ساتھ دو عورتیں عدالت میں کھڑی ضرور ہوں گی، لیکن گواہی ایک ہی عورت دے گی۔ دوسری عورت تب بولے گی جب اسے محسوس ہو کہ گواہی دینے والی کو گھبراہٹ کی وجہ سے کچھ مغالطہ لگ رہا ہے، تو دوسری یاد دھانی کرا کے اصلاح کرنے میں مدد دے گی۔ اگر گواہی دینے والی کو کوئی مغالطہ نہیں لگ رہا ہے، تو ساتھ کھڑی ہوئی عورت خاموش رہے گی۔ چونکہ عورتیں عموماً لین دین سے دور ہی رہتی ہیں، آج بھی اکثر عورتوں کی یہی حالت ہے اور عدالتوں میں جانے کا انہیں واسطہ بھی نہیں پڑتا، اس لیے کہا کہ ایک مرد اور دو عورتیں صرف لین دین کے معاملات پر گواہ کر لو۔ لیکن گواہی تو ایک ہی دے گی۔ اس لیے عورت کی گواہی آدھی قرار دینا درست نہیں ہے بلکہ یہ پوری گواہی ہی کہلائی جائے گی۔ یاد دہانی کے لئے دوسری عورت کو مدد کے لئے صرف اُنہی معاملات میں بلانے کے لئے کہا گیا ہے، جہاں مالی معاملات کے لئے گواہی درکار ہو۔ لہذا یہ مُطلق حکم کے طور پر نہیں بلکہ مقید حکم کے شرائط پوری ہونے کے تحت ہی لیا جا سکتا ہے۔

مالی معاملات کے علاوہ دوسرے سبھی معاملات میں ایک مرد کے ساتھ ایک ہی عورت کی مساوی گواہی درکار ہوتی ہے اور مدد کے لئے بھی دوسری عورت کو بلانے کی ضرورت کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔ اس لئے فقہی قوانین کی عورت کی گواہی کو آدھی ٹھہرانے کے مُطلق حکم کا کوئی جواز نہیں ہے، جس سے وہ عورت کے کمتر ہونے کی دلیل مہیا کر سکے۔

چوتھی دلیل، عورت کو پردہ اور گھروں میں رہنے کی تاکید:

عورتوں اور مردوں کا یکساں درجہ کے ممکن ہونے کے خلاف ایک دلیل یہ بھی سامنے لائی جاتی ہے کہ قرآن میں عورت

کے لئے پردہ میں رہنے کا حکم ہے اور پردہ میں محبوس پردے سے آزاد مرد سے کمتر کہلائے گی۔

پردہ سے مراد اور اُس کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ اِس سے کوئی بھی خواہ وہ مرد ہو یا عورت اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بے باک نہ ہونے دیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ پردہ کے اِس مقصد کے حصول لئے پہلے آیت نمبر 30 میں مرد پر اِس کے حکم کا اطلاق کیا گیا اور بعد میں اِس سے آگے کی آیت نمبر 31 میں عورت پر اِس کا اطلاق ہوا۔ لھذا یہ تاثر دینا کہ پردہ صِرف عورت کی ذات تک محدود ہے، صحیح بات نہیں ہوگی۔ اُس کا اطلاق دونوں مرد وزن پر ہوتا ہے۔

قرآن نے پہلے مرد کو ہدایت کی ہے کہ:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (24:30)

مومن مردوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بے باک نہ ہونے دیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ انسانی ذات کی نشوونما کرنے کے لئے بہترین طریقہ ہے۔ یاد رکھو! خدا کا قانونِ مکافات خوب جانتا ہے کہ تم نے احکام کی پابندی مصنوعی انداز میں کی ہے (یا دل کی گہرائیوں سے)۔

اس کے بعد کی آیت میں یہی حکم عورتوں کے لیے ہے۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (24:31)

مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بے باک نہ ہونے دیں، اور اپنی شرم گاہوں کی پوری پوری حفاظت کریں۔ ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اپنی زینت وآرائش کی چیزوں کا اظہار نہ کریں، سوائے اس کے کہ جس قدر چلتے پھرتے ازخود ظاہر ہو جائیں۔ انہیں چاہیے کہ اپنے اوڑھنے کی چادروں کو اپنے گریبانوں (سینوں) پر ڈال لیا کریں۔

خدا نے چغہ، یا چادر یا ایک کشادہ لباس پہننے کی غرض وغایت یہ بتائی تا کہ اپنی زینت کا اظہار نہ ہونے دیں، سوائے اپنے شوہروں کے سامنے، یا اپنے باپوں کے سامنے، یا اپنے شوہروں کے باپوں کے سامنے، یا اپنے بیٹوں کے سامنے، یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے سامنے، یا اپنے بھائیوں کے سامنے، یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے سامنے، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے سامنے، یا اپنے تعلق کی عورتوں کے سامنے، یا اُس زمانے میں اپنے غلام (لونڈیوں) کے سامنے، یا ایسے بوڑھے خدمت گار مردوں کے سامنے، جو جنسی ضرورت کی عمر سے نکل چکے ہوں، یا ایسے بچوں کے سامنے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ چیزوں (جنسیات) سے لاعلم ہوں۔ اور چلتے وقت عورتیں اپنے پاؤں اس زور سے زمین پر مار کر نہ چلیں کہ زیورات کی جھنکار

سے معلوم ہو جائے کہ کیا پہن رکھا ہے۔ اور اے ایمان والو! (مرد و عورت) سب مل کر اللہ کے قوانین کی اطاعت کرو تا کہ تمہیں زندگی کی کامرانیاں نصیب ہوں۔

زینت، جس کی پردہ کے ضمن میں ممانعت پر زور دیا جاتا ہے وہ چیز کہلاتی ہے جس سے آرائش کی جائے۔ کسی چیز یا بات کو خوشنما بنا کر دکھانا۔

قرآن کریم، صرف زندگی کا افادی پہلو (Utilitarian Aspect) ہی سامنے نہیں رکھتا بلکہ جمالیاتی پہلو (Aesthetic Aspect) پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس لئے وہ حکم دیتا ہے کہ (31:8)

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (7:31)

''ہماری اطاعت گزاری میں حُسن و زینت کو اختیار کرو۔''

قرآن کریم نے البتہ احتیاط برتنے کو کہا ہے جیسا کہ مندرجہ بال آیت (24:31) میں کہا گیا ہے کہ: ''عورتیں اپنی زینت کی چیزوں کو نمایاں نہ کریں۔'' جنسی جذبہ (بھوک اور پیاس کی قسم کا جذبہ) نہیں جو از خود بیدار ہو جائے۔ یہ جذبہ بیدار کرنے سے بیدار ہوتا ہے۔ قرآن کریم ان اسباب و ذرائع کی نگرانی کرتا ہے جو اس جذبہ کی بیداری کے محرک بن سکتے ہیں۔ عورت کی طرف سے غیروں کے سامنے نمودِ حُسن یا اظہارِ زینت، سب سے بڑا محرک ہے۔ قرآن کریم اس پر پابندی عائد کرتا ہے۔

اِس کے لئے (33:59) میں بھی مزید وضاحت کی گئی ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (33:59)

''اے نبی! تو اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے، اور مومنوں کی عورتوں کو تاکید کر دے کہ وہ باہر نکلیں، تو اپنے کپڑوں کے اوپر ایسا کشادہ سا کپڑا پہن لیا کریں، (جس سے زینت نمایاں نہ ہو 24:33)۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ وہ پہچانی جا سکیں (کہ شریف بیبیاں جا رہی ہیں)، اور کوئی بدقماش اِنہیں تنگ نہ کرے۔ یہ چیز ان کے لئے قانون خداوندی کی رو سے حفاظت اور تربیّت کا موجب بن جائے گی۔

عوتوں کو اپنے پہنے ہوئے کپڑوں کے اوپر کشادہ چغہ یا چادر لینے کی غرض و غایت خدا نے یہ بتائی کہ

(1) پہچانی جا سکیں کہ کوئی اوباش عورت یا عورتیں نہیں جا رہی ہیں، بلکہ یہ شریف بیبیاں ہیں؛

(2) کوئی بدقماش شخص انہیں نہ چھیڑ سکے؛

(3) اس روش کو اپنانے سے ان میں حفاظت کا احساس ابھرے گا اور

(4) حفاظت کے احساس سے ان میں عصمت کی حفاظت کی تربیّت ہو جائے۔

آداب معاشرت سے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات دینے کے بعد قرآن نگاہوں کی حفاظت اور تحفّظ عصمت کی طرف آ گیا ہے۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ قرآن محض سزاؤں پر زور نہیں دیتا، بلکہ وہ پہلے حفاظتی تدابیر بیان کرتا ہے تاکہ جرم سرزد نہ ہونے پائے۔ عصمت وعفّت کو خطرہ نگاہوں کے ذریعے ہوتا ہے، اس لئے تم اپنی نگاہوں کو بے باک مت ہونے دو۔ انسانی ذات کی نشوونما قلب ونگاہ کی پاکیزگی سے ہوتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے آپ تزکیہ کہتے ہیں۔ نگاہوں کو بے باک نہ ہونے دینے کا حکم پہلے مردوں کے لئے ہے اور بعد میں عورتوں کے لئے ہے۔ ہم سارا الزام عورتوں پر رکھتے ہیں۔ اگر مرد آگے نہ بڑھے تو عورت کیا کرلے گی؟ حضرت یوسف کا واقعہ ثبوت کے لئے کافی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ (24:30)

''اگر مصنوعی انداز میں آنکھیں نیچی کر بھی لوگے، لیکن دل میں پاکیزگی نہیں ہے، تو خدا خوب جانتا ہے کہ کیا کچھ تم مصنوعی انداز میں کرتے ہو اور دل میں تمہارے کیا خباثتیں بھری ہوئی ہیں۔

آیت (24:31) میں نگاہوں کو بے باک نہ کرنے کی ہدایت کے ساتھ ہی زیبائش اور زینت کے بارے میں بھی تاکیدیں دے دیں۔ اس آیت میں یبدین لفظ آیا ہے، جس کے معنی ارادتاً کسی چیز کی نمود ونمائش کرنا ہے۔''

ظہر لفظ کے معنی ہیں، وہ نمود ونمائش جو بغیر ارادے کے ازخود ظاہر ہو جائیں یعنی چلتے چلتے آستین اوپر چڑھ جائے، پلو ہٹ جائے یا سر سے کپڑا بغیر ارادے کے سرک جائے، تو یہ قرآن کی رو سے ''الّا ما ظہر'' والی بات ہے، لیکن اصل بات یہ ہے زیبائش وآرائش ظاہر کرنے میں کوئی ارادہ شامل ہے تو یہ الّا ما ظہر میں نہیں آئے گا، یہ بالارادہ نمود ونمائش میں آجائے گا، جسے منع کیا گیا ہے۔ منع اس لئے کیا گیا ہے کہ زیبائش وآرائش کی اگر بالارادہ نمائش ہوگی، تو نمود میں تسلسل ہوگا اور یہ بات مردوں کے لئے کشش کا باعث بنے گی۔ اس آیت میں تو یبدین ہے، لیکن ایک دوسری آیت میں لفظ تبرج (33:33) میں یوں سامنے آتا ہے کہ

وَقَرۡنَ فِیۡ بُیُوۡتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجۡنَ تَبَرُّجَ الۡجَاہِلِیَّۃِ الۡاُوۡلٰی (33:33)

اور تم نہایت سنجیدگی اور وقار سے اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو (تم سے کوئی چھچھورے پن کی بات سرزد نہ ہو)۔ اور جب تم باہر جاؤ تو اپنی زینت کی نمود ونمائش نہ کرو، جیسا کہ قرآن سے پہلے عہد جاہلیّت میں عورتیں کیا کرتی تھیں (یعنی کوئی حرکت ایسی نہ کرو، جو مردوں کے جذبات میں اضطراب وتلاطم پیدا کرنے کا موجب بنے) (31-24:40)۔

تبرج: ''کا مادہ ہے'' ب رج برج اور ترجمہ ہے ابھار۔ زیبائش وآرائش کو ابھار کر دکھانا، نمود ونمائش کا جذبہ ہے، جس کو منع کیا گیا ہے۔ تبرج وہ ذہنیّت ہے، جس کے تحت زینت وآرائش کو ابھارا جاتا ہے۔ بہرحال قرآن نے زیب وزینت اور آرائش کی چیزوں کو حرام قرار نہیں دیا ہے۔ قرآن تو بس نمود ونمائش کے جذبے کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ یہ تو عورتوں کے بارے میں مردوں کا پیدا کردہ احساسِ کمتری ہے کہ ''عورت ناقص العقل ہے، کام نہیں کرسکتی''، جس کے سبب عورت مرد کی نگاہ

میں جاذبِ نظر بننے کی طرف راغب ہوتی ہے۔ ویسے تو میاں بیوی ایک دوسرے کے رفیقِ حیات ہوتے ہیں اور دونوں میں ہم دوش چلنے کی پوری پوری صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ جنس کے اعتبار سے خدا نے کسی کو غالب اور کسی کو پست نہیں بنایا ہے۔ خدا نے اس لئے عورتوں کو نمودِ حسن سے منع فرمایا کہ اس سے خواہ مخواہ عورت اپنے آپ کو کمتر درجے کی سمجھنے لگ جائے گی۔

قرآن کہتا یہ ہے کہ نبی کے گھرانے کی عورتیں وقار سے گھر میں رہیں۔ نمود و نمائش حسن کا جذبہ کبھی تمہارے دلوں کے اندر نہیں آنا چاہیئے۔ یہ اس لئے نہیں کہا گیا ہے کہ مردوں کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے، بلکہ رسول اللہؐ کے گھرانے کی پاکیزگی مطلوب ہے۔ وہ ایمان ہی کیا، جو دعوتِ نظارہ سے خطرے میں پڑ جائے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اُمّ (ماں) کے مادہ سے مُشتق اُمت کا وجود بنتا ہے۔ بچوں اور گھر کے ماحول کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنانے کے اِس فریضہ کی اہمیت کو ذہن میں رکھ کر بیوی کا درجہ اگر زیادہ نہیں تو کمتر ہونے کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اِس کے بالمقابل شوہر کا قرآن میں اپنی فیملی کی حفاظت اور پرورش کرنے کے لئے ہر قسم کے وسائل مہیا کرنے کا فریضہ مقرر کیا گیا ہے اور اِس کا جوابدہ ٹھہرایا جاتا ہے۔ اِس ذُمہ داری کو خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کی بِنا پر فیملی کو اُس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

پانچویں دلیل: عورت کو مرد کے دِل بہلاوے کے لئے پیدا کرنا:

یہ وزنی دلیل بھی بچپن سے ہی سُننے میں آتی ہے کہ آدم کی زوج حوا (عورت) کو آدم ہی کی پسلی سے اُس کو تسکین پہنچانے کے لئے پیدا کیا گیا۔ لہٰذا اِس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عورت کا مرد کے ساتھ یکساں درجہ دینے کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ لہٰذا ہمارے لئے صدیوں سے جاری اسلاف کا اِس دعوٰی کا تفصیلی تجزیہ لیا جانا لازم ہو جاتا ہے۔

اِنسان اور کائنات اور یہاں کے خصوصی موضوع کے حوالہ سے زوج کے عدم سے وجود میں آنے کے ضمن میں نظریہ ارتقاء کے تحت اب تک بُہت تحقیق ہو چکی ہے، جس کا مُختصر طور پر تجزیہ یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔

قدیم مذہبی نظریہ ارتقاء:

چودہ سو سال پہلے ہی نہیں، جب قرآن کی ہمیں راہنمائی ملی، بلکہ اُس سے بھی بہت پہلے تورات اور دیگر مذاہب کی سب ہی کتابوں میں ارتقاء کا تصور نہیں ملتا۔ اُن سب میں یہی بات سامنے آتی ہے کہ خدا نے کہا ''کُن'' اور یہ کائنات وجود میں آ گئی۔ یعنی جس طرح سے جو چیزیں آج ہمیں نظر آتی ہیں، کُن سے یہ سب چیزیں اِسی شکل میں پیدا ہو گئیں، اور اِسی شکل میں اُسی طرح سے پہلے دن سے آج تک چلی آ رہی ہیں۔ تین سو سال پہلے تک ہمارے ہاں حکماء کا بھی تصور یہی تھا کہ دنیا میں جتنی چیزیں موجود ہیں، وہ اِسی شکل میں سامنے آ گئیں۔ خود آدمی کے متعلق تو یہ بہرحال تورات اور دنیا کی ہر کتاب میں موجود ہے کہ خدا نے پہلے ایک آدمی کو پیدا کیا اور پھر اُس کے بعد اُس کی پسلی سے مرد کو سکون پہنچانے کی وجہ سے عورت کو پیدا کر دیا۔ ہماری تفسیری روایات میں اِسی پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ زیبِ داستان میں یہ بھی اضافہ کیا گیا کہ پسلی چونکہ ٹیڑھی ہوتی ہے اس لئے

عورت کی سرشت ہی میں ٹیڑھا پن شامل ہوتا ہے اور اس کا سیدھا کرنا ناممکن ہے۔ اِس لئے کہ پسلی کو سیدھا کرنے کے عمل میں وہ ٹوٹ جائے گی لیکن سیدھی نہیں ہوگی۔ مکتبِ مُلا کو تو موقعہ کی تلاش ہوتی ہے تو اُس نے قرآن سے تفسیری روایات کا سہارا لے کر یہ فتوٰی بھی صادر کر دیا کہ آدم کو جنت سے نکالے جانے کی وجہ حوا کے آدم کو بہکانے کا عمل تھا۔ اُن کو یہ توفیق بھی نصیب نہ ہوئی کہ وہ قرآن کی متعلقہ آیت کے تثنیہ دونوں پر مبنی صیغہ سے ہی وضاحت لے لیتے کہ:

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ص (2:36)

شیطان یعنی مفاد پرست جذبات نے ان دونوں (مرد اور عورت) کے ارادے کو مفاد پرستی کے سبز باغ دکھا کر پھسلا دیا، انسان کو فہم و عقل کی استعداد دی گئی ہے کہ وہ اپنے زمانے کی علمی سطح پر پرکھ کر اِسے کام میں لائے۔ لہذا یہاں جدید نظریہ کے خصوصی طور پر زوج سے متعلقہ اہم نُکات کو بھی سامنے لا کر وضاحت کی جاتی ہے۔

انسانی پیدائش کا جدید نظریہ ارتقاء:

کوئی تین سو سال پہلے سائنس نے یہ بات بے نقاب (Discover) کی کہ یہ جو بھی خارجی کائنات انسانوں سمیت ہے، یہ پہلے دن سے اِس شکل میں سامنے نہیں آ گئی تھی۔ ہر شے کا آغاز پست ترین درجے میں ہوا۔ ہر شے ہزاروں لاکھوں سال کی منزلیں طے کرتی ہوئی، موجودہ شکل میں پہنچی۔ پہلا نقطہ آغاز کیسے ہوا؟ اِس کے متعلق نہ سائنس کچھ کہہ سکی ہے، نہ کہہ سکے گی۔ اِس لئے سائنس دانوں نے یہ کہا کہ کسی نہ کسی طرح اتفاق سے یہ وجود میں آ گئی۔

ذہن انسانی قرآن کی روشنی میں اب تک حیات کے ارتقاء کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے، اُسے مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

1۔ ارض پر زندگی (Life) کی ابتداء پانی سے ہوتی ہے۔

2۔ پانی اور مٹی کے امتزاج سے زندگی کے جرثومۂ اولین کو پیکر عطا ہوا۔

3۔ زندگی کے یہ جراثیم جوشِ نمو میں مختلف نوعوں (جس میں نر و مادہ بھی شامل ہے) میں تقسیم ہو کر ایک درخت کی شاخوں کی طرح بڑھنے پھولنے لگے۔

4۔ اِن جراثیم کے پیکروں میں ہزار ہزار سال کے مراحل کے بعد مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔

5۔ ان طویل المعیاد مراحل کو طے کر کے سلسلۂ تخلیق اس منزل پر پہنچا، جسے تخلیق بذریعہ تولید کہتے ہیں۔

6۔ حیوانی زندگی اِسی قسم کے غیر محسوس، اور طویل المعیاد مراحل طے کرنے کے بعد منزل بمنزل انسانی پیکر میں جلوہ ریز ہوئی۔

(جاری ہے)

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل)

Chapter 2: Life's Essence (*Khum-e Zindagi* - خم زندگی) –

Message to Fellow-Seekers

3

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1957)

By G. A. Parwez

(Translated by: M. Alam)

Opposition since last year

This is what the enemies of Tulu-e-Islam decided to do last year. It has been brought to my attention by different Bazms that they have come to Tulu-e-Islam posing as friends and well-wishers but their intention is to harm this movement from inside. You all know that we have nothing hidden that they want to steal it. Everything we do and write is out into the open. We are not concerned about them stealing our secrets because we *have* no secrets. So, what are they here for? Why have they joined you? Well, they want to create internal chaos in our collective peace. They want to sow the seeds of doubts and suspicions among us. They want to entangle you in abstract discussions. They want to engage in religious debates and trivial hairsplitting so that you cannot focus on your programs and actions. They try their best that this organized effort somehow acquires the form of a party. This they do within this movement. But when they go outside they engage in distortion and propaganda against Tulu-e-Islam's teachings, its message and its thought. People believe their maleficence because they think that they are inside members of the Tulu-e-Islam family. This is the biggest harm that comes to Tulu-e-Islam from such people.

Ignorant friends

That is one group that comes to Tulu-e-Islam with the intention of purposefully harming it. But a bigger threat comes to it from its naïve friends who have good intentions but get easily carried away by such propaganda and become tools in the hands of the first group. You can investigate and single out those enemies who deliberately join Tulu-e-Islam in order to harm it; but what can you say about its ignorant friends who become tools of destruction in the hands of the scheming ones?

A revolutionary movement – whose mission is to bring about change in people's thoughts and minds – needs to be extra careful in the initial phase of the call from such a danger. The Quran has suggested تعوذ (*Ta'oodh*) for such a situation: قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ (113:1) – The stage which this revolution is now entering is likely to produce a clash with the opposing forces. You thus have to be very careful: Just like how a new-born baby needs its mother's company for protection, you should tell your followers that they should take refuge under Allah's universal system of sustenance, whose Law of creation and evolution stipulates that something new always results from the clash of positive (constructive) and destructive forces. When the seed bursts then the plant emerges. قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ (114:1) – To achieve the objective mentioned above we should come closer to the Divine Law which provides for the nourishment of the whole of humanity (and not of a particular group of people or tribe). He is the

Sustainer of the whole world (1:1). Did you notice my friends what prescription the Quran prescribes to protect a new-born movement from dangers lurking in the shadows? It tells its sincere members of the movement to remain close to the center of its thought and system. In case of any danger they should immediately come under the protection of the center; and refer any issue to the center for receiving advice and guidance.

Remedy

This is explained in Surah Al-Nisa thus: وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَاِلٰٓى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا (4:83) – These people are not habituated to a disciplined life. Whenever they hear any news of peace or danger they broadcast it directly. Had they brought the news to the notice of the Prophet (PBUH) or the local authority, those who have been charged with the responsibility of scrutinizing news would have found out the truth. Were it not for Allah's goodness towards you, the majority amongst you would have followed the Devil.

Keeping the above critical instruction of the Quran regarding this issue in mind, I have decided to lay down a framework of guidance and a code of conduct for Bazm members; so that sincere fellow-travelers accompanying us on this journey may be able to get proper direction. These instructions will serve as constitution and bylaws for all the Bazms. I request you to please go through this document of guidance carefully. Those who agree with this guidance they should consider themselves as members of Tulu-e-Islam. Those who disagree with it and think that this unduly constrains their activities should find a different outlet for their activities. Tulu-e-Islam does not have monopoly on Quranic thought and actions. Those who have the passion and the energy for this work they can find whatever channel is suitable to them for realizing their goals and ambitions. But you will agree with me that, for anyone who wants to remain associated with Tulu-e-Islam, it is necessary that he/she must abide by its code of conduct and guidance. It will not be acceptable that one remains associated with Tulu-e-Islam and engages in ideologies and activities contrary to its code of conduct and its guidelines.

***

My dear brothers, whatever I had to say I have said it. I am thankful to you that you have attentively listened to my request with deep interest and great passion. In the end I want to express my heart-felt thanks to Allah for providing me with sincere friends like you. It is a fact that, in the journey of life, having a true friend lessens the difficulties of the way and brings the destination closer and closer. Your friendship, if I recall these past years, has made my desires younger; my courage loftier; my intentions stronger; my life full of beautiful spring; and my dying worthwhile. I feel Allah has done favor and says:– Be Alive with full spirit! Who knows my ideas – which I thought were no more than lovely fragrant dreams of shining silent stories of my deep imaginations – could turn into the form of a beautiful fully alive new world? *This* is the new world that Adam has been searching for millennia ever since he was

kicked out of heaven – and finds shelter nowhere. This is the lost paradise which is the pinnacle of his desires; the final destination of his hopes; and final hope of his life. This is the heavenly earth on whose gate is written in shining white moonlight color: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (3:97) – whoever enters this gate, would get complete peace and security.

Think my dear brothers! If by your struggle; if by your passion and drive; if by your warmth and love for humanity; if by your crying at night and rising in the early morning – the gates of this earthly heaven for humanity opens up and the atmosphere starts echoing with songs of …

Adam has risen and a revolution has happened;
In front of fistful of dust stars have bowed down!

…

Then what could be better than this for humanity's shining destiny. O caravan of passion! O travelers marching towards the destination of love! Move forward because the world is waiting and singing:

Bring on the revolution, bring the mirror shining;
We are eyeing at you with great promise longing!

May Allah's cosmic forces be with you and help you in this mission: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ (41:30-32) – People who proclaim that Allah alone is their Sustainer and remain firm and steadfast in their commitment so much so that no power on earth can influence them otherwise, then the heavenly forces will descend upon them and strengthen them further. They will say, "Have no fear, apprehension or grief; but rejoice and receive the happy news of the blissful life of heavenly society that has been promised to you." We are your close friends in this life; and we will be your close friends in the hereafter. You will therefore enjoy this blissful life in this world as well as in the life to come. In this blissful happy life you will get whatever you desire or ask for." Whatever you desire will happen and whatever you want will be provided. This will be the result of your unshakable faith and continuous work! All this will be provided to them with due grace and dignity, like the way a host caters to his guests. This will include provisions from Almighty which will protect them from all dangers; and will also contain means of their nurturing development.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل)

We are also Muslims like other Muslims

(Explanatory Remarks, Tulu-e-Islam Convention, November, 1956)

By G. A. Parwez

(Translated by: M. Alam)

My dear friends, this convention has been going well according to the formal program agenda for the past three days. But now I want to talk about some issues as a family by setting aside the formalities of the program. Time is short and a whole world of possibilities is calling on us. And I want to say something very important at this point.

I have been hearing some people declare that I became Muslim last year; that I became Muslim three years ago, etc. I know what they really want to say but the words they are choosing to express that are quite inappropriate. In fact, these words are misleading. Let me point out that we were Muslims before and we are Muslims now – the same kind of Muslims as other Muslims of the milieu, except that we want to understand the real framework of the دین (*Deen*) that Allah sent to humanity; and we want to know how it can be practically implemented in this piece of land. So, we cannot be different from other Muslims or consider ourselves in anyway superior to the rest of the Muslims. As for the meaning of the claim that "we have been Muslims for so many years …" – even this is not right because to be a Muslim is no child's play. As Allama Iqbal says:

It's to step in a witness stand of conviction;
People think it is easy to become a Muslim!

Another place he says:

Whenever I say I am Muslim, I tremble;
As I know the difficulties of "La Ilah"!

So, please tell me who it is among us who could really claim to be a Muslim in the true sense of its meaning? On the other hand, it is my claim that if only few of you who are present here could become true Muslims then there will be revolution in the world order.

Can anyone imagine the immense power of Momin?
Destinies get transformed by the glance of Momin!

Please ponder my friends! If that were the case then: would any of these issues and problems that we are facing today will remain? The Quran goes so far as to say that if you are a Muslim then you can surpass the limits of the Earth and the planets. If we had really and truly become Muslims for three years then

the destiny of the world would have changed. Therefore, we should not make a claim which is not supported by our character and deed. This is very serious.

Importance of prayer

I have also heard some members say that there is no need of prayers now that we have understood Islam. I want to ask such members: This is what Tulu-e-Islam has taught you that you should feel proud for not performing prayers? You continue to live non-Quran life and you are engaged in non-Islamic habits but you are prompted to talk like this now? And the irony is that you are engaged in such talks expressly by associating yourselves with Tulu-e-Islam. How great an allegation is this that you have leveled against Tulu-e-Islam?

I myself have personal weaknesses that I always admit. But it is extremely wrong to find excuses for one's own weaknesses and shortcomings. You are doing everything against the Quranic values and guidelines? Business, trade, banking, marriage, parties, and relationships – everything is going on? You didn't think of bringing them into line with the Quran? Then why is such talk when it comes to prayer? We can reform society only by starting it from within our own homes. But if we abandon our prayers and fasts then how will reformation take place? For God's sake please keep your words and deeds based on knowledge and sincerity. Do not look for "sacred" excuses. Instead, admit your weaknesses and shortcomings. We have to establish a Quranic society which can only be possible to do by leading an honest and sincere life.

However, you can say that we have understood the concept of دین (*Deen*) in *such and such* way; and that when it gets established practically then things will be done in *such and such* way. But you can start doing many things right now, e.g., fulfilling promises, speaking truth, not deceiving, etc. You don't need to wait for the دین (*Deen*) to be established for these?

When things reached my attention I had to clarify the reality of the situation.

Wrong methods

I do not want to say anything about your resolutions. But I do want to say that I have lit a small lamp with my blood and my wish is that it continues to remain lit while it moves forward. But it won't simply be lit by money because the oil that illuminates it comes from deep inside the heart and is more valuable than any (yellow, white or black) gold. To keep it illuminated requires flames of inner fire. There is no doubt that money is indispensable to propagate any thought, but money is not everything. In the words of Allama Iqbal:

The reason is something else, which you know that yourself;
The downfall of Muslim society is not due to lack of wealth!

Do not even think of using any wrong means in this sacred work? Please note that even one wrong step destroys everything in the path of حق (*Haq* or Truth). This lamp which illuminates the earth and the heavens – نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ – cannot be lit by wrong means. Every member of our movement should be such that, by looking at him from afar, people can say that here comes a living example of Quranic thought. When the Prophet (PBUH) was asked about the truthfulness of his mission then he simply replied: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (10:16) – I have dwelt amongst you all my life before (this revelation came to me). Can't you understand this much? Please remember this: To tread on the Quranic path among the crowd of enemies is a tall claim. This difficult journey can't be covered with external resources. The seeds of our movement will sprout from the depth of our hearts; and their rise and growth will tell everyone what the universal system of sustenance is? Propagating the literature alone will also not be able to achieve anything. Adam was told: وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (2:36) – and on earth you shall have your abode and your livelihood for a while [Asad]. The Earth provides support for our subsistence. We will definitely make use of its resources. But this support should be like the water that supports a ship. But the same water if it goes inside the ship during storm – then you know what happens to the ship? Therefore, do not let material supports overwhelm the ship of your struggle and travails. Keep these material supports under check of the power of your Iman. To bring about Quranic revolution in front of the world use honesty, steadfast determination, fortitude, sincerity, patience, and perseverance. And have 100% conviction in the Quranic mission.

Lot of propaganda is being directed against this movement. Many false rumors are being circulated against you. But you prove by your actions that you are neither a religious sect nor a political party. We are also aboard the Millat's ship together with others. If God forbid, this ship were to go down we will also drown along with others.

It is our good fortune that we got a piece of land for the establishment of the Quranic system. The association of Tulu-e-Islam with the Pakistan movement was precisely because of this: that it is not possible to establish the دین (*Deen*) without having a piece of land. Now that we have got that piece of land, all our struggles must be so that that دین (*Deen*) gets established here. From your side nothing whatsoever should happen that might be detrimental in any way to this land called Pakistan. To defend this land is your first and the foremost duty no matter even if you have to put your life on the line in order to do that.

O Almighty, the Creator of the Universe, O Allah! We have come to you with our utmost sincere and true feelings for understanding your Book and to follow it and to try our best to establish it.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

محسوس سجدہ اس کے اس پرخلوص جذبہ کا بیساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ہی (Form) ہے' تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ درحقیقت رکوع وسجود وعبادت کی روح انسان کے جذبہ فرماں پذیری اور اطاعت کے محسوس مظہر ہیں۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے' تو نہ صرف خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں بلکہ قرآن کریم کے الفاظ میں انسان کے لئے تباہی کا موجب ہے۔ قرآن کریم میں ان محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل صلوٰۃ اور حج کی تقاریب میں باقی رکھی گئی ہیں اور وہ بھی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی عمل ہیں۔ جن میں ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ یہ اجتماعی شکل نزول قرآن کے وقت میں' نبی اکرم ﷺ اور جماعت مومنین میں رائج تھی اور مساجد میں ادا کی جاتی تھی۔ جس طرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے' اسی طرح مسجد سے بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں لیا جاتا تھا جو اس نظام کا مرکز ہو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' کے معنی اطاعت کے ہیں اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلوٰۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے اس لئے وہ بھی عبادت ہے۔ ''عبادت'' کے لئے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جا سکے۔

عبادت کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ملحوظِ نگاہ رکھنا ضروری ہے کہ:

(1) قرآن میں جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا' اس کے معنی قوانین خداوندی کی برضا ورغبت اطاعت ہوں گے (1:5)۔

(2) قرآن میں جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا' اس سے مفہوم یا تو انسانوں کے خود اپنے جذبات یا من دون اللہ' باطل پرست مذہبی پیشواؤں کی اطاعت ہوگی' اِن سے منع کیا گیا ہے (30:13, 19:44)۔

(3) قرآن میں جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا' وہاں مفہوم اِن کی توہم پرستانہ پرستش ہوگا (19:42)۔

(4) قرآن میں عبادُ الرَّحمٰن کے معنی ہیں وہ لوگ جو زندگی کی ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کریں (51:56)۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 69
ISSUE
10

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

یہ وہ لوگ ہیں جو اُن تمام صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو (اے رسول!) تجھ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی ہیں، اور جو تجھ سے پہلے پیغمبروں کو اُن کے اپنے اپنے وقت میں دی گئی تھیں (اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں)—— اِن صداقتوں پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صحیح تاریخی شہادتوں سے اِس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اِس پروگرام پر اِس سے پہلے بھی کئی بار عمل ہو چکا ہے اور اس سے ہر بار وہی نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کا اب وعدہ کیا جاتا ہے، اس لیے اب بھی وہی نتائج مرتب ہوں گے —— وہ اِس طرح اِس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اِس ضابطۂ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود ہو جاتی ہے اور یوں حال کی جدوجہد سے اِنسان کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے —— وہ مستقبل جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔

(مفہوم القرآن سورۃ البقرہ 4:)